مباحث پر روشنی ڈالنے کے علاوہ القانون کے یورپ، آکسفورڈ اور ہندوستان کے بعض قلمی نسخوں کے متعلق ضروری معلومات بھی تحریر کیے ہیں اور پروفیسر توغان کی کوششوں کی تحسین بھی کی ہے، اب جناب مسیح الحسن صاحب نے آزاد بھون کی لائبریری سے مولانا کے اس غیر مطبوعہ مقالہ کی نقل حاصل کرکے اسے شائع کیا ہے، شروع میں ان کے قلم سے اس کے متعلق بعض وضاحتیں بھی درج ہیں اور یہ جناب ضیاء الحسن فاروقی کے مقدمہ وحواشی سے بھی مزین ہے، مقدمہ میں البیرونی کے حالات وکمالات خاص والہانہ انداز سے لکھے گئے ہیں، اکثر لوگوں کو مولانا کی اس تحریر کا علم نہ ہوگا، اس علمی تبرک کو شائع کرنے والے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

تحدید نسل اور اسلامی تعلیمات: مرتبہ مولوی عبید اللہ الاسعدی صاحب تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۵۲، مجلد مع گرد پوش، قیمت دس روپے، پتہ: اسلامک بک سنٹر مکارم نگر، لکھنؤ،

تحدید نسل اور ضبط تولید کی حمایت ومخالفت میں بہت لکھا گیا ہے، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اس میں تحدید نسل کی موجودہ کوششوں اور رائج وعام صورتوں کو اسلامی نقطۂ نظر سے باطل قرار دیا گیا ہے، شروع میں عالم کی تخلیق وبقاء کے طبعی نظام اور مخلوق کی رزق رسانی کے قدرتی انتظام کو بیان کرکے تحدید نسل اور بڑھتی ہوئی آبادی کی روک تھام کی ضرورت کے جو اسباب بتائے جاتے ہیں اُن کا جواب دیا ہے، اور افزائشِ نسل اور توالد وتناسل کو منشائے قدرت بتایا ہے، مصنف نے نکاح کو افزائشِ نسل کی صحیح صورت قرار دینے کے بعد اس کی ضرورت، مصلحت اور شرعی اہمیت واضح کی ہے، آخر میں ضبط نسل کی صورتوں، قتل اولاد، اسقاط، نسبندی، اختصار اور عزل کے متعلق احکامِ شریعت بیان کیے ہیں، اور اس سلسلہ میں قرآن وحدیث کے نصوص کے علاوہ علمائے اسلام کے اقوال بھی پیش کیے ہیں، کتاب کی ترتیب سلیقہ سے کی گئی ہے اور اس سے زیر بحث مسئلہ کو سمجھنے میں مدد ملے گی، اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔

"ض"

جلد ۱۲۷ ماہ رجب المرجب ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۸۱ء عدد ۵

مضامین

شذرات

چودہ سو سال ہجری کے اچھے مسلمان حکمرانوں کی جہانبانی کے اصولوں پر تبصرہ کرتے ہوئے معارف کی گذشتہ اشاعت میں صرف بنوامیہ کے دور کا احاطہ ہو سکا تھا، اب اس کے بعد کے فرمانرواؤں پر بھی ایک نظر ڈالنی ہے۔

عباسی خلفاء میں منصور سب سے زیادہ باوقار حکمراں تھا، مورخوں کا بیان ہے کہ وہ حزم، عقل، علم، اصابت رائے، حسن تدبیر، وقار اور تمکنت کے لحاظ سے دنیا کے عظیم ترین سلاطین میں تھا، خلوت میں خوش مزاج اور خوش اخلاق رہتا تھا، لیکن دربار میں آکر بدل جاتا، اپنے لڑکوں سے کہہ رکھا تھا کہ دربار میں وہ قریب نہ آئیں، ممکن ہے کہ ان کو اس سے نقصان پہونچ جائے، وہ نازک ترین موقعوں پر بھی مطلق نہ گھبراتا، اس کا سارا وقت حکومت کی آمدنی، اس کے مصارف، رعایا کی فلاح و بہبود کے مسائل پر غور و فکر میں گذرتا، وہ حکومت کے باغیوں کے لیے نرمی روا نہ رکھتا، لیکن امن پسند رعایا کے لیے عادل تھا، اس کا قول تھا کہ خلیفہ کو صرف تقویٰ درست رکھ سکتا ہے، سلطان کو اطاعت اور رعایا کو عدل، جو سزا دینے پر قدرت رکھتا ہے اس کے لیے عفو و درگذر زیادہ مناسب ہے، اور وہ بڑا کم عقل ہے جو اپنے زیر دستوں پر ظلم کرتا ہے، وہ بادشاہت کو خدا کی حبل متین اور دین قیم کو اس کا عروۃ الوثقیٰ سمجھتا رہا۔

محمد مہدی بن منصور خلیفہ ہوا تو اس کی دعاؤں میں ایک دعا یہ بھی تھی کہ بار الٰہا! میں زوال سے پناہ مانگتا ہوں، ایک بار سخت طوفان آیا تو اس نے فرش خاک پر اپنا سر رکھ کر یہ دعا کی کہ "خدایا! امت محمدؐ کی حفاظت کر، ہمارے دشمنوں کو ہماری تباہی پر ہنسنے کا موقع نہ دے، اگر میرے گناہوں کی پاداش میں تو نے عالم کو پکڑا ہے تو یہ پیشانی تیرے حضور میں ہے" اس کی نگاہ میں دولت کی کوئی وقعت نہ تھی، جو دولت ظلم و زیادتی سے حاصل کی جاتی اس کو واپس کر دیتا۔

ہادی بن موسیٰ اپنی نجی صحبتوں میں بے تکلف رہتا، اس کے رضاعی بھائی حسین بن معاذ بن مسلم کا بیان ہے کہ میں نجی صحبتوں میں اس کو پچھاڑ کر زمین پر پٹک دیتا تھا، لیکن جب وہ دربار میں آتا تو مجھ پر اس کے خوف اور ہیبت سے لرزہ طاری ہو جاتا، اس نے حکم دے رکھا تھا کہ کسی شخص کو اس کے پاس آنے سے روکا نہ جائے کیونکہ اس سے برکت جاتی رہتی ہے۔

ہارون رشید کا شمار دنیا کے بہترین حکمرانوں میں کیا جاتا ہے، اس کی شخصیت یورپین مصنفوں کے لیے ایک دلآویز افسانہ بنی ہوئی ہے، قاضی ابو یوسف نے اپنی مشہور تصنیف کتاب الخراج اسی کے لیے لکھی، اس میں انہوں نے اس کو مخاطب کر کے لکھا کہ وہ تقویٰ اختیار کرے، اس کو اپنے خدا کے یہاں وہی چیز پیش کرنی ہوگی جو ایک والا اپنے مالک کی خدمت میں کرتا ہے، وہ اپنی رعایا کے ساتھ حق و انصاف سے پیش آئے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے خوش قسمت وہ راعی ہوگا جس کی رعایا کو خوش بختی حاصل ہو، غصہ کی بنا پر مواخذہ کرنا صحیح نہیں، اگر کوئی معاملہ ایسا آئے جس میں ایک میں دنیا کا بھلا ہو اور دوسرے میں آخرت کا تو آخرت کی بھلائی قابل ترجیح ہے، جو شخص خدا کے لیے تقویٰ اختیار کرتا ہے خدا اس کو ضرور بچاتا ہے، خراج کے وصول کرنے والے صالح لوگ ہوں، وہ خراج ادا کرنے والوں کی تحقیر و تذلیل نہ کریں، جب تک خبر رساں اور پرچہ نگار عادل اور ثقہ نہ ہوں ان کی اطلاعیں قبول نہ کی جائیں، ہارون رشید ان ہی باتوں پر عمل کرتا رہا۔

وہ بے کسوں اور حاجت مندوں کا ملجا اور ماویٰ بن گیا تھا، خشیت الٰہی میں روزانہ سو رکعتیں نفلیں پڑھتا تھا، روزانہ ایک ہزار درہم خیرات کرتا، اکثر حج کرتا، ایک بار اس کے سامنے یہ حدیث دہرائی گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری آرزو ہے کہ خدا کی راہ میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر مارا جاؤں، اس حدیث کو سن کر روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی، اسی کے بعد سے ایک سال حج کرتا اور ایک سال جہاد میں شریک ہوتا، ایک اور موقع پر اس کو ابن سماک نے یہ نصیحت کی کہ کل تجھے خدا کے روبرو جانا ہے، وہاں تجھے دو مقاموں میں سے ایک مقام اختیار کرنا ہے، جنت یا دوزخ، یہ سن کر وہ اس قدر رویا کہ اس کی

داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی۔

مامون بن ہارون رشید ظلم وجور کو کسی حال میں پسند نہ کرتا، اس کے ایوان عدالت میں ادنیٰ آدمی شہزادوں سے اپنا حق لے سکتا تھا، ایک بار خود اس کو ایک فریق کی حیثیت سے عدالت میں حاضر ہونا پڑا، خدام نے اس کے لیے قالین بچھانا چاہا، قاضی القضاۃ نے یہ کہہ کر اس کو رکوا دیا کہ عدالت میں مدعی اور مدعا علیہ دونوں برابر ہیں، مامون نے خوش ہوکر قاضی کی تنخواہ میں اضافہ کردیا، وہ بڑا بردبار بھی تھا، اس لیے عفو و درگذر سے کام لیتا، کہتا کہ اگر لوگوں کو میرے عفو کا اندازہ ہوجائے تو وہ جرائم کو میرے تقرب کا ذریعہ بنائیں، وہ حتی الوسع اپنا کام خود کرتا، اپنے ملازموں اور خادموں کو بھی تکلیف نہ دیتا، کہتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قوم کا سردار قوم کا خادم ہوتا ہے، اس کے مذہبی عقائد مختلف فیہ بن گئے تھے، مگر اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے بڑا والہانہ لگاؤ رہا، دمشق کے دورے میں اس کو آپ کا فرمان ملا تو اس کو آنکھوں سے لگا کر رویا، اور اس میں جو کچھ لکھا تھا اس پر عمل کرایا۔

ایک بار ایک خارجی اس کے پاس آیا اور بڑی سختی سے بولا کہ تم جس جگہ پر بیٹھے ہو کیا تم کو متفقہ طور پر بٹھایا گیا ہے یا تم زور و ظلم سے اس پر بیٹھ گئے ہو؟ مامون نے حلم و بردباری کے ساتھ جواب دیا کہ دونوں میں سے کوئی بات صحیح نہیں، جو مسلمانوں کی سلطنت پر فرمانروائی کرتا تھا، اسی نے مجھ کو اور میرے بھائی کو یہ حکومت سپرد کی، میں چاہتا تھا کہ لوگوں سے استصواب رائے کروں، مگر اس کے لیے اپنی جگہ چھوڑ دیتا تو اسلام کا امن خطرہ میں پڑ جاتا، نظام درہم برہم ہوجاتا، طرح طرح کے جھگڑے کھڑے ہوجاتے، شاہراہوں پر بدامنی بڑھ جاتی، حجاج کے لیے راستے میں رکاوٹیں پیدا ہوجاتیں، اس لیے لوگوں کی خاطر اپنی جگہ پر قائم رہا،

لیکن لوگ میری جگہ پر کسی اور کو متفقہ طور پر بٹھا دیں تو میں اپنی جگہ چھوڑ سکتا ہوں، خارجی نے یہ سب کچھ سنا تو یہ کہہ کر واپس ہوگیا: تجھ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو، وہ بغاوت پر آمادہ تھا، مگر مامون کی باتیں سن کر مطمئن ہوگیا، مامون کہا کرتا تھا کہ معاویہؓ کی قوت عمرو بن العاصؓ کے بل پر تھی، عبدالملک کا سہارا حجاج تھا، لیکن میری قوت و عظمت خود میری ذات سے ہے۔

معتصم باللہ حکومت کے دبدبہ اور اس کی شان و شوکت کو قائم رکھنے میں ہر ممکن کوشش کرتا، مگر اپنی نجی زندگی میں سادگی کو پسند کرتا، واثق باللہ چھوٹا مامون کہلاتا تھا، اس نے رفاہ عام کے کام اتنے انجام دیے کہ لوگ اس کی موت کے بعد مدتوں رویا کیے، متوکل علی اللہ کا دور اپنی سرسبزی، شادابی اور فارغ البالی اور تمدنی نفاستوں اور نزاکتوں کی وجہ سے مورخین کی نظر میں عہد سرور اور عہد زریں تھا، منتصر باللہ کی ہیبت سے رعایا کانپتی تھی مگر اس کے عدل و انصاف کی وجہ سے اس کی گرویدہ تھی۔

مہتدی باللہ نے قیام عدل کے لیے قبۃ المظالم کے نام سے ایک عمارت بنوائی تھی، اس میں اگر اس کا لڑکا بھی ماخوذ ہوکر آتا تو اس کی رو رعایت نہ کرتا، اس نے دربار کے تمام مسرفانہ اور عیاشانہ تکلفات کو ختم کرکے اس کو راہب کی ایک خانقاہ بنا دیا تھا، وہ کہا کرتا کہ مجھے عمر بن عبدالعزیزؓ کے راستے پر چلنے دو، تاکہ بنو عباس میں بھی ایک عمر بن عبدالعزیزؓ پیدا ہوجائے، معتضد باللہ بڑا جری حکمراں تھا، اپنے لشکریوں کے ساتھ میدان جنگ میں اتر کر ان کے دوش بدوش لڑتا، فوجی مہم میں اس کو اپنا لباس بدلنے کی بھی فرصت نہ ہوتی۔

مکتفی باللہ میں جہانبانی کے اوصاف تو کم تھے لیکن اپنی نرمی کی وجہ سے اپنی پوری مملکت میں محبوب رہا، راضی باللہ نے اپنی فیاضی اور سیر چشمی میں بنو عباس کے عہد زریں کی یاد تازہ کردی تھی، قادر باللہ نے اپنے زہد، تقویٰ، سیادت، دینداری، تہجد گذاری، صدقات

وخیرات کی کثرت اور کریم النفسی کی وجہ سے بنو عباس کی زوال پذیری کے زمانہ میں حکومت کے وقار کو بہت کچھ سنبھالا، اس کے بہت کچھ اوصاف ہارون رشید کے تھے، اپنے زمانہ کے عقائد کی تصحیح کے لیے ایک کتاب لکھی جو محدثین کے حلقہ میں پڑھی جاتی تھی۔

قائم بامراللہ بڑا متقی اور دیندار حکمراں رہا، رات بھر عبادت کرتا، اکثر روزے رکھتا، اہل حاجت کی حاجت پوری کرنے میں تاخیر نہ کرتا، اس کی وجہ سے زوال پذیر حکومت میں قوت پیدا ہوئی، مقتدی بامراللہ نے دین اور سیاست کو ایک ساتھ جمع کر کے خلافت کے وقار کو بڑھایا، اس کے دور میں خیر کی برکت ہوئی اور رزق میں کشادگی پیدا ہوئی، مستظہر باللہ سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہونچی، اس کا زمانہ رعایا کے سرور و شادمانی کا دور تھا، مسترشد باللہ شجاع، عالی ہمت، صائب الرائے، علم نواز، عابد اور زاہد ہونے کے علاوہ ملک کا خیر خواہ اور رعایا کے لیے شفیق رہا، ناصر لدین اللہ اپنی سیاست، بصیرت، تیز طبعی، حاضر دماغی کی بدولت عباسی جاہ و جلال کی آخری یادگار تھا، ظاہر باللہ نے اپنی نو مہینے کی حکومت میں عمرؓ بن عبدالعزیز کی یاد تازہ کر دی، مستنصر باللہ کی حکومت میں بڑا شکوہ و تجمل رہا، لیکن اسی کے ساتھ وہ بڑا عادل اور دیندار حکمراں تھا۔

بنو عباس ہی کے زمانہ میں سلجوقی حکومت قائم ہوئی تو اس کا فرمانروا طغرل اپنی جہانبانی کے لیے مشہور ہوا، وہ نماز پنجگانہ باجماعت ادا کرتا، تہجد کا پابند رہا، ہر جمعہ اور دوشنبہ کو روزہ رکھتا، کہتا کہ مجھے خدا سے شرم معلوم ہوتی ہے کہ کوئی عمارت بنواؤں اور اس کے پہلو میں مسجد نہ ہو، اس کا صحیح جانشین الپ ارسلان ہوا، اس کی سطوت اور ہیبت سے ایک عالم اس کے سامنے جھک گیا تھا اور وہ سلطان العالم کہلاتا، وہ اصل محاصل کے سوا ناجائز آمدنی اپنے خزانہ میں داخل ہونے نہ دیتا، اس نے مسکینوں کے لیے ایک مطبخ کھول رکھا تھا، جس میں پچاس ۵۰ بکرے

روزانہ ذبح ہوتے تھے، رمضان شریف میں پندرہ ہزار اشرفیاں غرباء میں تقسیم کرتا۔

الپ ارسلان کا جانشین ملک شاہ ملک گیری اور ملک داری میں دنیا کے بہترین فرماں رواؤں میں شمار کیا جاتا ہے، اپنی شجاعت کی وجہ سے جس سمت رخ کیا اس کو زیر نگیں کر کے چھوڑا، اپنی عدل پروری کی وجہ سے الملک العادل کے لقب سے مشہور ہوا، رفاہ عام کے بہت سے کام انجام دیے، پوری مملکت میں سڑکوں کے جال بچھا دیے، سرائیں بنوائیں، دریاؤں پر پل تعمیر کرائے، حرم کے خدام کے لیے جاگیریں مقرر کیں، اس کے وزیر نظام الملک کے اوصاف و کمالات، فضائل و مناقب، علم نوازی، مذہبی خدمات، عدل پروری، دینداری اور غرباپروری کی دھوم تھی، اس کے ایسا وزیر مسلمانوں کی تاریخ میں پھر کوئی اور نہ ہو سکا، سلجوقی فرماں رواؤں میں سنجر کا آئین جہانبانی اب تک مشہور ہے، وہ سلجوقی خاندان کی عزت و ناموس کا محافظ تھا، سلطان اعظم کے لقب سے مشہور رہا، حرمین تک میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا۔

عباسیوں ہی کے زمانہ میں زنگی خاندان کی حکومت قائم ہوئی تو اس کا فرمانروا عماد الدین زنگی اپنی حکمرانی، شجاعت، عدل اور دینداری کی وجہ سے ایک بہترین فرمانروا ہوا، وہ اپنے امراء کو ان کے درجہ سے آگے نہ بڑھنے دیتا، ان پر اعتماد بھی رکھتا تھا، لیکن ان کی پوری نگرانی بھی کرتا، اس نے صلیبی جنگ کے محاربات میں حصّہ لے کر اس کا رخ بدل دیا، اس نے اپنی فوج کی تنظیم ایسی کر رکھی تھی کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کوچ کرتی تو معلوم ہوتا کہ دو رسیاں تان دی گئی ہیں اور وہ اس کے

درمیان سے گذر رہی ہے۔

اس کا جانشین نور الدین زنگی صلیبی جنگ کا ہیرو ہوگیا، اسی جنگ میں اس کے بھائی کی ایک آنکھ جاتی رہی تو اس نے اس پر اظہار افسوس کرنے کے بجائے یہ کہا کہ اگر میرا بھائی دیکھ سکتا کہ اس کے صلہ میں اس کو بہشت میں کیا ملے گا تو وہ اپنی دوسری آنکھ بھی قربان کردیتا۔ اس کے سپاہی اس سے بڑی محبت کرتے، بڑی پامردی سے اس کے دوش بدوش ہوکر لڑتے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ لڑائی میں مارے بھی گئے، تو وہ ان کے اہل عیال کی پوری خبر گیری کرتا رہے گا، وہ بڑا دیندار بھی تھا، اسلامی فقہ کے مطابق کھانے پینے کی جن چیزوں اور پوشاکوں کی اجازت تھی وہی خود استعمال کرتا اور اپنی رعایا سے استعمال کراتا۔

صلاح الدین ایوبی تو اپنی سپہگری، بلند حوصلگی، جہانبانی، رواداری، دینداری، جلالت، شہامت اور سطوت کے لحاظ سے دنیا کے تمام حکمرانوں کا ایسا سرتاج بن گیا کہ نہ صرف ایشیا بلکہ یورپ میں بھی ناول نگاروں اور گانے والوں کے لیے ایک موضوع بنا ہوا ہے، وہ ہیروؤں کا ہیرو ہے۔

عیسائیوں نے جب پہلی دفعہ بیت المقدس پر تسلط حاصل کیا تو ان کو فخر تھا کہ ان کے گھوڑوں کے گھٹنوں تک مسلمانوں کا خون تھا، لیکن جب صلاح الدین بیت المقدس میں فاتح ہوکر داخل ہوا تو اس نے شہر کے ہر ناکہ پر ایک امیر کو تعینات کر رکھا تھا کہ کسی عیسائی کو گزند نہ پہونچے۔ گبن لکھتا ہے کہ وہ قرآن کے دشمنوں کے ساتھ ہر طرح کی سختی سے پیش آنے میں حق بجانب تھا، مگر اس نے بیت المقدس میں داخل ہوکر جس فیاضانہ رحمدلی کا ثبوت دیا اس سے وہ نہ صرف تعریف و تحسین بلکہ محبت کیے جانے کا مستحق ہے۔

مقالات

جناب مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی یاد میں

از سید صباح الدین عبد الرحمن

(۲)

مہاجرین جلد دوم | یہ شاہ صاحب کی پہلی باضابطہ تصنیف ہے جو ۱۹۲۶ء میں دار المصنفین سے بڑے آب و تاب کے ساتھ شائع ہوئی، ان کو یہاں آئے ہوئے ابھی کل چار سال ہوئے تھے کہ یہ کتاب ان کے قلم سے لکھ کر تیار بھی ہوگئی اور چھپ کر لوگوں کے ہاتھوں تک پہونچ گئی، جو بہت شوق سے علمی حلقہ میں پڑھی گئی، اس میں ایک سو ایک مہاجر صحابہ کرام کے حالات ہیں، اس کتاب کی ترتیب میں حسب ذیل ماخذوں کا سہارا لیا گیا ہے:

صحیح بخاری، ابن سعد، صحیح مسلم، طبری، البلاذری کی فتوح البلدان، تاریخ ابن اثیر، فتح الباری، مستدرک حاکم، استیعاب، تاریخ ابو الفداء، تہذیب التہذیب ابن حجر، تاریخ ابن خلکان، اسد الغابہ، تذکرۃ الحفاظ، موطا امام مالک، مسند احمد بن حنبل، اصابہ، اعلام الموقعین ابن قیم، شرح موطا شاہ ولی اللہ، ازالۃ الخفا، ابوداؤد، جمع الفوائد، ترمذی، تہذیب الکمال، کتاب الولاۃ کندی، مقریزی، یعقوبی، اخبار الطوال، حسن المحاضرہ سیوطی، ابن خلدون، زرقانی۔

ان ماخذوں کے نام کتابیات کی مصنوعی فہرست سے نہیں لیے گئے، بلکہ جب جب ان سے مدد لی گئی ہے اس کے حوالے نیچے حواشی میں موجود ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ ان ماخذوں کا مطالعہ کرکے ان سے استفادہ کیا گیا ہے۔

یوں تو اس کتاب میں جتنے مہاجر صحابہؓ کے حالات لکھے گئے اُن میں ہر ایک کی سیرت میں کچھ ایسے روشن پہلو ہیں جن کو پڑھ کر ذہن منور ہوتا ہے، مگر اس میں حضرت عبداللہؓ بن عمر، حضرت سلمانؓ فارسی، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت خالدؓ بن ولید کے تذکرے خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہیں، شاہ صاحبؒ نے ان کے حالات ایسے انداز میں پیش کیے ہیں کہ ان کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم بہت سے دلآویز مضامین کا ایک مجموعہ پڑھ رہے ہیں، یہ شاہ صاحب کے انداز تحریر کی خوبی ہے جو ٹھیک دبستان شبلی کے عین مطابق ہے، شروع سے آخر تک انداز بیان میں ادب، احترام اور وزن قائم رکھنے کا اہتمام ہے، جس سے تحریر میں تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔

اس میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے خلق نبوی، جہاد فی سبیل اللہ، مال و دولت سے استغناء، احتیاط فی الحدیثؓ، احتیاط فی الفتادی، خشیت الٰہی، زہد و ورع، مشتبہات سے اجتناب، مسکین نوازی، فیاضی، سیر چشمی، اختلافات سے احتراز، اظہار حق میں جرأت اور بے باکی کا ذکر شاہ صاحب جس خوش سلیقگی سے قلمبند کرتے ہیں، اس کو پڑھ کر ایمان تازہ ہو جاتا ہے، حضرت عبداللہؓ بن عمر کے کردار میں نزاکت اس وقت پیدا ہوگئی جب انھوں نے امیر معاویہؓ کے بعد یزید کی بیعت کرلی، شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ بیعت کرتے وقت فرمایا کہ اگر یہ خیر ہے تو ہم اس سے راضی ہیں، اور اگر شر ہے تو ہم نے صبر کیا، لیکن اسی کے بعد جب مدینہ والوں نے فسخ بیعت کیا اس وقت عبداللہؓ بن عمر بڑی کشمکش میں مبتلا ہوگئے، شاہ صاحب نے اس کی تفصیل جس طرح قلمبند کی ہے اس سے ان کا کردار اور اونچا نظر آتا ہے، شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے اہل و عیال کو بلاکر فرمایا کہ میں نے اس شخص کے ہاتھ پر خدا اور رسولؐ کی بیعت کی ہے، اور میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ قیامت کے دن ہر دھوکہ باز کا ایک ایک جھنڈا کھڑا کیا جائے گا کہ یہ فلاں کی فریب کاری ہے، اور سب سے بڑا فریب یہ ہے کہ خدا کے ساتھ شرک کیا جائے کہ ایک شخص کسی کے ہاتھ پر خدا اور رسول کے لیے بیعت کرے، اور پھر اس کو فسخ کردے، اس لیے ہم میں سے کوئی شخص فسخ بیعت میں حصہ نہ لے، اگر کسی نے حصہ لیا تو

میرے اور اس کے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی۔

یہ واقعہ پڑھتے وقت خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ انھوں نے شاید کسی لالچ یا خوف کی بنا پر ایسا رویہ اختیار کیا ہو، لیکن شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ امیر معاویہؓ نے جب یزید کو ولی عہد بنانا چاہا تو عمرو بن العاصؓ کو ان کے پاس ان کا عندیہ لینے کے لیے بھیجا، انھوں نے جاکر دبی زبان سے اس کا اظہار کیا اور اس کے عوض ایک رقم خطیر پیش کرنا چاہی، رشوت کا نام سن کر وہ غصہ سے کانپ اٹھے اور اسی وقت عمرو بن العاصؓ کو کھڑے کھڑے نکال دیا۔

اس زمانہ میں حجاج بن یوسف کی سنگدلی اور شقاوت کے سامنے کوئی دم نہیں مار سکتا تھا، مگر وہ جس طرح بے باکانہ طریقہ سے اس کی سرزنش کرتے رہے اس کو شاہ صاحب نے بہت ہی خوبصورت انداز میں قلمبند کیا ہے، لکھتے ہیں ایک دن حجاج خطبہ دے رہا تھا، اس کو اس قدر طول دیا کہ عصر کا وقت تنگ ہوگیا، آپ نے فرمایا: آفتاب تیرا انتظار نہیں کر سکتا، حجاج نے کہا: جی میں آتا ہے کہ تمھاری آنکھیں پھوڑ دوں، فرمایا: تجھ کوتاہ بیں سے یہ بھی کچھ بعید نہیں، ایک اور موقع پر حجاج نے اپنے خطبہ میں عبداللہ بن زبیرؓ پر یہ اتہام لگایا کہ انھوں نے نعوذ باللہ کلام اللہ میں تحریف کی ہے، حضرت عبداللہؓ بن عمر نے اس کی تردید کی اور فرمایا: تو جھوٹ بولتا ہے، نہ ابن زبیر میں اتنی طاقت ہے، نہ تجھ میں یہ مجال ہے، مگر اسی کے ساتھ ان کے کردار کا یہ پہلو بھی ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں تلخ سے تلخ باتیں سن کر پی جاتے تھے، ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ کو پیہم گالیاں دینی شروع کیں، آپ نے صرف اس قدر جواب دیا کہ میں اور میرے بھائی عالی نسب ہیں، پھر خاموش ہوگئے، شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اس تواضع اور حلم کا نتیجہ یہ تھا کہ عام طور پر لوگوں میں آپ کو محبوبیت حاصل تھی، مجاہد کہتے ہیں کہ ایک دن میں ابن عمرؓ کے ساتھ نکلا، لوگ بکثرت ان کو سلام کر رہے تھے، انھوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ لوگ مجھ سے اس قدر محبت کرتے ہیں کہ اگر چاندی سونے کے عوض بھی محبت خریدنا چاہوں تو اس سے زیادہ نہیں مل سکتی۔

عبداللہ بن عمرؓ ہی کے سلسلہ میں شاہ صاحب کی اس کتاب میں یہ واقعہ بھی درج ہے :

"سفیان ثوریؒ، امام شعبیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ عبداللہ بن زبیرؓ، مصعب بن زبیر، عبدالملک بن مروان، اور عبداللہ بن عمرؓ چاروں آدمی خانۂ کعبہ میں جمع تھے، سب کی رائے ہوئی کہ ہر شخص رکن یمانی پکڑ کر خدا سے اپنی اپنی دلی تمناؤں کے لیے دعا مانگے، پہلے عبداللہ بن زبیرؓ اٹھے اور دعا مانگی کہ خدایا تو بڑا ہے، اور تجھ سے بڑی ہی چیزیں مانگی جاتی ہیں، اس لیے میں تجھ کو تیرے عرش، تیرے حرم، تیرے نبیؐ، اور تیری ذات کی حرمت کا واسطہ دلا کر دعا کرتا ہوں کہ مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک کہ حجاز پر میری خلافت اور عام خلافت نہ تسلیم کر لی جائے، اس کے بعد مصعبؓ بن زبیر اٹھے اور رکن یمانی پکڑ کر دعا مانگی کہ تو تمام چیزوں کا رب ہے، آخر میں سب کو تیری ہی طرف لوٹنا ہے، میں تیری اس قدرت کا واسطہ دے کر جس کے قبضہ میں تمام عالم ہے، دعا کرتا ہوں کہ مجھے اس وقت تک دنیا سے نہ اٹھا جب تک کہ میں عراق کا والی نہ ہو جاؤں اور سکینہ میرے نکاح میں نہ آجائے، اس کے بعد عبدالملک نے کھڑے ہو کر دعا کی کہ اے زمین و آسمان کے خدا! میں تجھ سے ایسی چیزیں مانگتا ہوں جس کو تیرے اطاعت گذار بندوں نے تیرے حکم سے مانگا ہے، میں تجھ سے تیری ذات کی حرمت، تیری مخلوقات کی حرمت، بیت الحرم کے رہنے والوں کے حق کا واسطہ دے کر دعا مانگتا ہوں کہ تو مجھ کو دنیا سے اس وقت تک نہ اٹھا جب تک کہ مشرق و مغرب پر میری حکومت نہ ہو جائے اور اس میں جو شخص رخنہ اندازی کرے اس کا سر نہ قلم کر دوں، جب یہ لوگ دعا مانگ چکے تو وہ بادۂ حق کا سرشار اٹھا جس کے نزدیک دنیاوی طمطراق کی حیثیت سراب سے زیادہ نہ تھی، اور اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ تو رحمن و رحیم ہے، میں تیری رحمت کا واسطہ دے کر دعا کرتا ہوں جو تیرے غضب پر غالب ہے کہ تو مجھے آخرت میں رسوا نہ کر اور اس عالم میں مجھے جنت عطا فرما۔"

صرف اس واقعہ سے اندازہ ہو گا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا کردار کتنا بلند تھا، اور ان میں کتنی خشیت الٰہی تھی

مگر اس روایت کو شاہ صاحبؒ نے جس مؤثر اور باوقار انداز میں لکھا ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہ خود سب کچھ خوف الٰہی سے متاثر ہو کر لکھ رہے ہیں، ان کی کتاب میں ان کی تحریر کا کچھ ایسا ہی باوقار انداز شروع سے آخر تک قائم ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ ان صحابہ میں ہیں جو علم حدیث کے اساطین سمجھے جاتے ہیں، آپ صحابۂ کرامؓ کی کی جماعت میں سب سے بڑے حافظ حدیث تھے، ان کی اس فضیلت کی کہانی ذرا شاہ صاحب کی زبانی سن کر محظوظ ہوں:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ ابوہریرہؓ علم کا ظرف ہیں..... وہ خود اپنی کثرت حدیث کے وجوہ بیان کرتے تھے کہ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ابوہریرہ بہت حدیثیں بیان کرتا ہے، حالانکہ مہاجر و انصار ان حدیثوں کو نہیں بیان کرتے، مگر معترضین اس پر غور نہیں کرتے کہ ہمارے مہاجر بھائی بازاروں میں اپنے کاروبار میں لگے رہتے تھے، انصار اپنی زراعت کی دیکھ بھال میں سرگرداں رہتے تھے، میں محتاج آدمی تھا، میرا سارا وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں گذرتا تھا، اور جن اوقات میں وہ لوگ موجود نہ ہوتے تھے اس وقت بھی موجود رہتا تھا، دوسرے جن چیزوں کو وہ بھلا دیتے تھے میں ان کو یاد رکھتا تھا، حضرت ابوہریرہؓ کی اس توجیہ کی تصدیق اکابر صحابہؓ کرتے تھے، ابو عامر روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت طلحہؓ کے پاس بیٹھا تھا کہ اتنے میں ایک شخص نے آکر کہا، ابو محمد! آج تک ہم کو نہ معلوم ہو سکا کہ یہ یمنی (ابوہریرہؓ) اقوال نبیؐ کا بڑا حافظ ہے یا تم لوگ؟ انھوں نے جواب دیا کہ بلاشبہ انھوں نے بہت سی ایسی حدیثیں سنیں جو ہم لوگوں نے نہیں سنیں، وہ بہت سی ایسی باتیں جانتے ہیں جو ہمارے علم سے باہر ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ دولت و جائداد والے تھے، ہمارے گھر بار اور اہل و عیال تھے، ہم ان میں پھنسے رہتے تھے، صرف صبح و شام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری دے کر لوٹ آتے تھے اور ابوہریرہؓ مسکین اور مال و متاع

کی زحمتوں اور بال بچوں کی ذمہ داری سے سبکدوش تھے، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے آپؐ کے ساتھ ساتھ رہتے تھے، ہم سب کو یہ یقین ہے کہ انھوں نے ہم سب سے زیادہ احادیث نبوی سنیں، اور ہم میں سے کسی نے ان پر یہ اتہام نہیں لگایا کہ وہ بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے ہوئے ان کو بیان کرتے ہیں، حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے تھے کہ ابوہریرہؓ ہم سب سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے حاضر باش تھے، ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے ان کو بلاکر پوچھا کہ کیسی حدیثیں بیان کرتے ہو، حالانکہ جو کچھ میں نے فعل نبویؐ دیکھا اور قول نبوی سنا، وہی تم نے دیکھا اور سنا، عرض کی: اماں! آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر زیب و زینت میں مصروف رہتی تھیں اور خدا کی قسم میری توجہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی چیز نہیں ہٹاتی تھی۔"

حضرت ابوہریرہؓ کی کثرت روایت سے بعض اشخاص کے دل میں ان کی روایت کی جانب سے شکوک وشبہات پیدا ہوگئے تو ان کا امتحان لیا گیا، کس طرح؟ وہ شاہ صاحب کی زبانی سنیے:

"ایک مرتبہ مروان نے امتحان کی غرض سے بلوایا اور اپنے کاتب کو نیچے بٹھاکر آپ سے حدیثیں پوچھنا شروع کیں، یہ بیان کرتے تھے اور کاتب چھپا ہوا ان کی لاعلمی میں لکھتا جاتا تھا، دوسرے سال اسی طریقہ سے امتحان لیا، اس مرتبہ بھی انھوں نے بلاکم وکاست وہی جوابات دیے جو ایک سال قبل دے چکے تھے، حتیٰ کہ ترتیب میں کوئی فرق نہ آیا۔"

حضرت ابوہریرہؓ کو اللہ تعالیٰ نے جس فیاضی سے یہ علم عطا کیا، اسی فیاضی سے اس کو انھوں نے مسلمانوں کے لیے وقف عام کیا، شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے جہاں بھی کچھ مسلمان مل جاتے ان کے کانوں تک اقوال نبیؐ پہونچا دیتے، ان کے علم وعرفان کی بارش سے عورتیں بھی سیراب ہوتی تھیں، کسی عورت کا کوئی فعل خلاف احکام نبویؐ سرزد ہوجاتا تو ٹوک دیتے، ان کے زمرۂ رواۃ میں حضرت

عائشہؓ کا نام بھی نظر آتا ہے، اسی سلسلہ میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"آپ کے دامن کمال میں جس قدر علمی جواہر تھے سب عام مسلمانوں میں تقسیم کر دیے، لیکن وہ احادیث جو فتنہ سے متعلق تھیں اور جن کو آنحضرتؐ نے پیشین گوئی کے طور پر فرمایا تھا، زبان سے نہ نکالیں کہ یہ خود فتنہ کی بنیاد بن جاتیں، فرماتے تھے کہ میں نے احادیث نبویؐ دو ظرف میں محفوظ کی ہیں، ایک ظرف کی تو پھیلادیں، مگر دوسرے کی پھیلادوں تو نرخرہ کاٹ ڈالا جائے، صوفیہ کہتے ہیں کہ وہ اسرار توحید کی امانت تھے، متکلمین کہتے ہیں وہ اسرار دین تھے، لیکن محدثین کا قول یہی ہے کہ وہ فتنہ کی حدیثیں تھیں۔"

حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جائے گا، لیکن شاہ صاحب نے اپنی تحریر کے ایجاز کے ساتھ چند صفحوں میں ان کی عظمت کی جو مرقع آرائی کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کی سیرت کے بہت سے واقعات شاہ صاحب نے اپنی کتاب میں قلمبند کیے ہیں مگر ان ہی میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب وہ آپ کا نام لیتے تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا امنڈ آتا، اس کی وجہ شاہ صاحبؒ کی اس موثر تحریر سے ظاہر ہوجائے گی

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو محبت اور یگانگت ان سے (یعنی حضرت ابوذر غفاریؓ سے) تھی وہ آخری لمحۂ حیات تک قائم رہی، چنانچہ مرض الموت میں آپؐ نے ان کو بلوا بھیجا، یہ حاضر خدمت ہوئے، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لیٹے ہوئے تھے، ابوذرؓ کے اوپر جھک گئے اور محبوب عالم نے ہاتھ بڑھا کر چمٹا لیا، نہ معلوم یہ نگاہ واپسیں کیا اثر کر گئی کہ آخر دم تک وارفتگی کا عالم طاری رہا۔"

ان چند سطروں میں کیسی تاثیر ہے، اس کے لکھنے والے کے قلم کے ساتھ دل کی کیفیت کا بھی تجزیہ تھوڑی دیر کے لیے کر لیجیے۔

شاہ صاحبؒ نے حضرت سلمان فارسیؓ کے کردار کا جو بلند نمونہ پیش کیا ہے، آج کل کے متمول مسلمان ان کی اس کتاب کے حسب ذیل اقتباس سے عبرت اور سبق حاصل کر سکتے ہیں:

"حضرت سلمانؓ جب پانچ ہزار تنخواہ پاتے تھے اور تیس ہزار نفوس پر حکومت کرتے تھے، اس وقت بھی ان کے پاس صرف ایک عبا تھی جس میں لکڑیاں جمع کرتے تھے، اس کا آدھا حصہ اوڑھتے اور آدھا بچھاتے تھے۔"

حضرت عمرو بن العاصؓ کی زندگی میں کچھ ایسے واقعات ہیں جو بہت ہی متنازعہ فیہ ہیں، حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد وہ امیر معاویہؓ کے طرف دار اور حضرت علیؓ کے مخالف ہو گئے، حضرت علیؓ کے خلاف صفین میں جو لڑائی لڑی گئی تو شامی فوج کے امیر العسکر حضرت عمرو بن العاصؓ ہی تھے، یہ لڑائی ختم ہوئی تو حضرت علیؓ اور معاویہؓ کے اختلاف کو دور کرنے کی خاطر ابو موسیٰ اشعریؓ کے ساتھ وہ بھی حکم بنائے گئے، اور دونوں تبادلۂ خیالات کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ دونوں کو معزول کر کے نئے سرے سے خلیفہ کا انتخاب کیا جائے تاکہ یہ کشت و خون کسی طرح بند ہو، مگر جب ایک مقررہ تاریخ پر دومۃ الجندل میں فریقین جمع ہوئے تو ابو موسیٰ اشعریؓ نے اپنا فیصلہ سنایا کہ میں نے دونوں کو معزول کیا، اور اب لوگوں کو اختیار ہے کہ جس کو خلافت کا اہل سمجھیں اس کو اپنا خلیفہ بنائیں، مگر جب عمرو بن العاصؓ کھڑے ہوئے تو انھوں نے اعلان کیا: آپ لوگوں نے ابو موسیٰؓ کا فیصلہ سن لیا، انھوں نے علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو معزول کیا۔ میں بھی علیؓ کو معزول کرتا ہوں لیکن معاویہؓ کو برقرار رکھتا ہوں۔

اس کے بعد حضرت علیؓ اور معاویہؓ کا اختلاف اتنا بڑھا کہ وہ تاریخ کی بہت ہی المناک روداد بن گئی، خارجیوں کا ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا جس نے حضرت علیؓ، امیر معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ تینوں کو ایک ساتھ قتل کر دینا پسند کیا، مگر ان کی اس ناپاک مہم میں حضرت علیؓ نے جام شہادت

نوش کیا، مگر امیر معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ زندہ بچ گئے، جس کے بعد امیر معاویہؓ نے ان کو مصر کا والی مقرر کیا، ان کی یہ وجاہت پسندی تاریخ میں متنازعہ فیہ بن گئی ہے، مگر مرض الموت میں ان کی جو سچی انابت ہے وہ بھی تاریخ کی ایک ایسی مثال ہے کہ سارے مسلمان اس سے بصیرت حاصل کر کے اپنی عاقبت سنوار سکتے ہیں، پھر شاہ صاحبؒ کے قلم نے اس کو اور بھی موثر بنا دیا ہے، ایسے واقعات لکھتے وقت اگر قلم کا زور بیان ساتھ نہ دے تو موثر واقعات کی تاثیر جاتی رہتی ہے، شاہ صاحبؒ نے اس واقعہ کے لکھنے میں جو تاثیر پیدا کی ہے وہ اس کے اقتباس کی طوالت کا خیال کیے بغیر اس کو صبر کر کے ناظرین پڑھ لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اپنے ایمان کو تازہ کر کے اپنی عاقبت کو سنوارنے میں ایسی انابت کو مشعل ہدایت نہ بنا لیں، شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

"عمرو بن العاصؓ ...... مرض الموت میں اپنی گذشتہ لغزشوں پر بہت نادم تھے، ابن عباسؓ عیادت کو آئے، سلام کے بعد پوچھا ابا عبد اللہ! کیا حال ہے؟ جواب دیا کیا پوچھتے ہو، دنیا کم بنائی مگر دین زیادہ بگاڑا، اگر اس کو بگاڑا ہوتا جس کو بنایا ہے اور اسے بنایا ہوتا جس کو بگاڑا ہے تو یقیناً کامیاب ہوتا، اگر اس وقت کی آرزو فائدہ مند ہوتی تو ضرور آرزو کرتا، اگر بھاگنے سے بچ سکتا تو ضرور بھاگتا، مگر اب منجنیق کی طرح زمین و آسمان کے درمیان معلق ہوں، نہ ہاتھوں کے سہارے اوپر چڑھ سکتا ہوں، نہ پاؤں کے سہارے نیچے اتر سکتا ہوں، اے بھتیجے! مجھ کو کوئی ایسی نصیحت کر کہ اس سے فائدہ اٹھاؤں، ابن عباسؓ نے کہا: افسوس اب وہ وقت کہاں، اب وہ بھتیجا بوڑھا ہو کر آپ کا بھائی ہو گیا ہے، اگر آپ رونے کے لیے کہیں تو میں رونے کو تیار ہوں، مقیم سفر کا کیسے یقین کر سکتا ہے، عمرو بن العاصؓ نے کہا اس وقت اسّی برس کے کچھ اوپر میری عمر ہے اور تو مجھ کو پروردگار کی رحمت سے ناامید کرتا ہے، خدایا! یہ ابن عباس مجھ کو تیری رحمت سے ناامید کر رہا ہے، ابھی تو مجھے یہاں تک تکلیف دے کہ راضی ہو جا، ابن عباسؓ نے کہا: ہیہات ابو عبد اللہ جو چیز تم نے لی وہ تو نئی تھی اور جو چیز دے رہے ہو وہ پرانی ہے، عمرو بن العاصؓ نے کہا: ابن عباسؓ تم کو کیا ہو گیا ہے جو بات

میں کہتا ہوں تم اس کا الٹا کہتے ہو۔"

پروردگار کی رحمت میں پناہ لینے کی کیسی موثر مرقع آرائی ہے مگر اس میں اور زیادہ تاثیر پیدا کرنے کی خاطر شاہ صاحب ایک اور روایت کا اضافہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ابن شمامہ مہری کہتے ہیں کہ ہم عمرو بن العاصؓ کے مرض الموت میں ان کی عیادت کو گئے، وہ دیوار کی طرف منھ پھیر کر رونے لگے، ان کے بیٹے عبداللہ نے دلاسا دیا کہ ابا کیا آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں فلاں بشارتیں نہیں دی ہیں؟ جواب دیا: میرے پاس افضل ترین دولت لا الہ الا اللہ، محمد رسول اللہ کی شہادت ہے، مجھ پر زندگی کے تین دور گذرے ہیں، ایک وہ دور تھا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت ترین دشمن تھا اور میری بڑی تمنا یہی تھی کہ کسی طرح قابو پاکر آپ کو قتل کردوں، اگر اسی حالت میں مرجاتا تو میرے لیے دوزخ یقینی تھی، پھر اللہ عزوجل نے میرے دل میں اسلام ڈالا، میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا، یا رسول اللہ! ہاتھ پھیلائیے، میں بیعت کروں گا، آپ نے ہاتھ بڑھایا تو میں نے سمیٹ لیا، فرمایا: عمرو بن العاصؓ! تم کو کیا ہوگیا، میں نے عرض کیا: میں ایک شرط چاہتا ہوں، فرمایا وہ کون سی شرط ہے؟ میں نے عرض کیا: میری مغفرت ہوجائے، فرمایا: عمرو بن العاصؓ! کیا تم کو معلوم نہیں کہ اسلام اپنے پہلے کے تمام گناہوں کو کالعدم کردیتا ہے، ہجرت اپنے پہلے کے گناہوں کو مٹا دیتی ہے، حج اپنے پہلے کے گناہوں کو گرادیتا ہے، اس کے بعد یہ حالت ہوگئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ نہ میرا کوئی محبوب رہا اور نہ ان سے زیادہ میری نگاہ میں کوئی بزرگ باقی رہا، میں آپ کی عظمت و ہیبت کی وجہ سے آپ کو نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتا تھا، اگر کوئی مجھ سے آپ کا حلیہ پوچھے تو میں نہیں بتا سکتا کہ میں نے نظر بھر کر کبھی دیکھا ہی نہیں، اگر اس حالت میں مرجاتا تو جنت کی امید تھی، پھر تیسرا دور آیا جس میں نے مختلف قسم کے اعمال کیے، اب میں یہ نہیں جانتا کہ میرا کیا حال ہوگا، جب میں مرجاؤں، تو نوحہ کرنے والیاں میرے ساتھ

نہ جائیں، جنازہ کے پیچھے آگ جائے، دفن کرتے وقت مٹی آہستہ آہستہ ڈالنا، دفن کرنے کے بعد اتنی دیر تک قبر کے پاس رہنا جب تک جانور ذبح کرکے اس کا گوشت تقسیم ہوجائے، تاکہ میں تمھاری وجہ سے مانوس ہوجاؤں، اور یہ غور کرلوں کہ اپنے رب کے قاصدوں کو کیا جواب دوں؟"

پہلے اقتباس سے ظاہر ہوگا کہ حضرت عمرو بن العاصؓ اپنے پروردگار کی رحمت کا سہارا لینا چاہتے تھے، مگر اس دوسرے اقتباس سے عیاں ہے کہ ان کو عشق رسولؐ سے رہا، اس کا سہارا ابھی اپنے مرض الموت میں لینے کی کوشش کی، مگر پھر خشیت الٰہی طاری ہوئی تو اس فکر سے بھی دب گئے کہ اپنے رب کے قاصدوں کو وہ کیا جواب دیں گے، موت کی ہیبت طاری ہوتی ہے، مگر اس کی ہیبت کے باوجود ایک بار پھر رحمت پروردگار کے طالب ہوتے ہیں، اس کی پوری تفصیل شاہ صاحب نے جس باوقار انداز میں قلمبند کی ہے، وہ ملاحظہ ہو:

"موت کے وقت اپنے نگہبان دستے کو بلا بھیجا اور پوچھا: میں تمھارا کیسا ساتھی تھا؟ جواب ملا کہ آپ ہمارے نہایت سچے ساتھی تھے، ہماری عزت کرتے تھے، ہم کو دل کھول کر دیتے لیتے تھے، یہ سلوک کرتے تھے، وہ سلوک کرتے تھے، کہا: میں یہ سب سلوک اس لیے کرتا تھا کہ تم مجھ کو موت سے بچاؤ گے، یہ موت سامنے کھڑی ہوئی ہے، کام تمام کرنا چاہتی ہے، اس کو کسی طرح سے میرے سامنے سے دور کردو، یہ عجیب فرمائش سن کر ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگے، کچھ دیر کے بعد بولے: ابا عبداللہ! خدا کی قسم ہم کو آپ سے ایسی فضول بات سننے کی امید نہ تھی، آپ جانتے ہیں کہ موت کے مقابلہ میں ہم آپ کے کچھ کام نہیں آسکتے۔ عمرو بن العاصؓ نے کہا کہ میں نے یہ جانتے ہوئے تم سے ایسی فرمائش کی تھی کہ تم موت کے مقابلہ میں میری کوئی مدد نہیں کرسکتے، کاش میں نے تم میں سے کسی کو اپنی حفاظت کے لیے نہ رکھا ہوتا، افسوس ابن ابی طالب سچ کہتے تھے کہ انسان کی محافظ خود اس کی موت ہے، خدایا! میں بری نہیں ہوں کہ معذرت کروں، طاقت ور نہیں ہوں کہ غالب آجاؤں، اگر تیری رحمت نے دست گیری نہ کی تو میں ہلاک ہوجاؤں گا۔"

موت آتی ہے تو اس وقت عموماً ہوش وحواس باقی نہیں رہتے، اگر حضرت عمروؓ بن العاص نے اپنی عقل اور اپنے حواس کو کس طرح قابو میں رکھا، اس کی تصویر کشی شاہ صاحب نے اس طرح کی ہے :

"عمرو بن العاص زندگی میں کہا کرتے تھے کہ مجھ کو لوگوں پر حیرت ہوتی ہے کہ جب ان کو موت آتی ہے تو عقل وحواس کے ہوتے ہوئے بھی وہ اس کی حقیقت نہیں بیان کر سکتے، اس وقت ان کے لڑکے نے کہا کہ ابا آپ کہا کرتے تھے کہ مجھ کو لوگوں پر تعجب آتا ہے کہ جب لوگوں کو موت آتی ہے تو عقل وحواس کے ہوتے ہوئے بھی اس کی کیفیت نہیں بیان کر سکتے، آپ کی موت آچکی ہے، عقل بھی موجود ہے، ذرا اس کی کیفیت بیان کیجیے، کہا: بیٹا موت کی صفت ناقابلِ بیان ہے، اس کی تھوڑی حقیقت بیان کرتا ہوں، مجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ جبل رضوی میری گردن پر ٹوٹا پڑتا ہے، کھجور کے کانٹے میرے پیٹ میں بھرے ہوئے ہیں، گویا میری جان سوئی کے ناکے سے نکل رہی ہے "

اسی ہوش وحواس کے ساتھ اپنی جان جس طرح موت کے حوالے کر دی اس کی تفصیل پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ وفات نہیں پا رہے تھے، بلکہ کسی لمبے سفر پر خوش خوش جا رہے تھے، اس کے لیے اپنے گھر والوں کو خاص خاص وصیتیں کیں، شاہ صاحب لکھتے ہیں:

" اس کے بعد اپنے صاحبزادے سے وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو پہلے معمولی پانی سے نہلا کر کپڑے سے خشک کرنا، پھر تازہ اور صاف پانی سے نہلانا، تیسری مرتبہ کافور آمیز پانی سے غسل دینا اور کپڑے سے خشک کرنا، کفناتے وقت ازار کس کے باندھنا کہ میں مخاصم ہوں گا، جنازہ درمیانی چال سے لے چلنا، لوگوں کو جنازہ کے پیچھے پیچھے رکھنا کہ اس کے آگے ملائکہ چلتے ہیں، اور پچھلا حصہ بنی آدم کے چلنے کیلئے ہے، قبر میں رکھنے کے بعد مٹی آہستہ آہستہ دینا، پھر دعا میں مصروف ہو گئے کہ الٰہا! تو نے حکم دیا ہم نے عدول حکمی کی، تو نے ممانعت کی ہم نے نافرمانی کی، میں بری نہیں ہوں کہ معذرت کروں، طاقتور نہیں ہوں کہ غالب آجاؤں، لا الٰہ الا اللہ، لا الٰہ الا اللہ، یہی کہتے کہتے جان جانِ آفریں کے

سپرد کر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

شاہ صاحب نے حضرت عمروؓ بن العاص کے مرض الموت کی جو جاندار تصویر کشی کی ہے اس کو جتنا زیادہ پڑھا جائے گا اتنا ہی خشیت الٰہی، رحمت پروردگار، عشق رسولؐ، احساس معصیت، اعتراف گناہ اور موت کے مردانہ وار مقابلہ کا جذبہ طاری ہوگا، اور اسی کے ساتھ شاہ صاحب کے اس حسن بیان پر ان کی مغفرت کے لیے دعائیں بھی زبان سے نکلیں گی۔

ان مثالوں سے اندازہ ہوگا کہ شاہ صاحب نے اپنی اس کتاب کو قلمبند کرنے میں اپنے اسلوب بیان کو کس خوبی سے نباہا ہے، ان کے یہاں ایجاز کے بھی اچھے نمونے ملتے ہیں، جس کی ایک عمدہ مثال حضرت خالدؓ بن ولید کے اوصاف کی مرقع آرائی ہے۔

حضرت خالدؓ بن ولید کو ذوق جہاد اور راہِ خدا میں سر دھڑ کی بازی لگانے میں آپ کو دربار رسالت سے سیف اللہ کا لقب ملا، تقریباً سوا سو لڑائیوں میں اپنی تلوار کے جوہر دکھائے، جسم میں ایک بالشت حصہ بھی ایسا نہ تھا جو تیروں اور تلواروں کے زخم سے چھلنی نہ ہوا ہو، اکثر ذوق جہاد میں کہا کرتے تھے کہ مجھے میدانِ جنگ کی سخت رات جس میں اپنے دشمنوں سے لڑوں اس شب عروسی سے زیادہ مرغوب ہے جس میں میری محبوبہ ہمکنار ہو، آخر وقت جب اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے، کہتے تھے کہ افسوس میری ساری زندگی میدانِ جنگ میں گذری، اور آج میں بستر مرگ پر جانوروں کی طرح ایڑیاں رگڑ کے جان دے رہا ہوں، خدا نے ان کے قدموں میں یہ خاص برکت دی تھی کہ جدھر رخ کیا ناکام واپس نہ ہوئے، جب وہ لڑائی میں شریک ہو جاتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے اب لڑائی کا تنور گرمایا۔

ان کے ان شجاعانہ اوصاف کے ساتھ ان کی زندگی کا ایک اہم واقعہ یہ بھی ہے کہ ان کو حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں فوج کی سپہ سالاری سے معزول کیا، اور اس معزولی کو انھوں نے بطیب خاطر قبول کیا جو ان کی مزید جلالت اور بڑائی کا ثبوت ہے۔

شاہ صاحبؒ نے حضرت خالدؓ کے ان تمام واقعات کو تقریباً ۲۸ صفحے میں قلمبند کیا ہے، مگر ان میں وہ تمام باتیں آگئی ہیں جن کو جاننا چاہیے، مصر سے حضرت خالدؓ پر ایک ضخیم کتاب شائع ہوئی، جو اردو میں اللہ کی تلوار کے نام سے شایع ہوئی ہے، اس کی ضخامت ۷۰۰ صفحے کی ہے، پورے وثوق کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کی کتاب کے ۲۸ صفحے کا جو ایجاز ہے، وہ اللہ کی تلوار کے ۷۰۰ صفحے کے اطناب پر بھاری ہے۔

مہاجرین جلد دوم کو ختم کرنے کے بعد شاہ صاحبؒ اپنی کتاب سیر الصحابہؓ جلد ششم لکھنے میں مشغول ہوگئے، اسی کے ساتھ وہ وقتاً فوقتاً معارف کے کالم تلخیص و تبصرہ اور اخبار علمیہ کے لیے بھی کچھ نہ کچھ لکھتے رہے، پھر ان کی کتاب عرب کی موجودہ حکومتیں کے کچھ ابواب بھی اس درمیان میں چھپتے رہے، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ پر ایک گستاخانہ مضمون کا تردیدی جواب

شاہ صاحبؒ کی ان علمی سرگرمیوں کے زمانہ میں لکھنؤ سے ایک رسالہ نگار نکلا کرتا تھا، جس کے مدیر نیاز فتحپوری تھے، وہ کوئی مستند اور سند یافتہ عالم نہ تھے، لیکن عالم ہونے کا دعوی کرتے تھے، ان کا رسالہ "نگار" کہنے کو تو ادبی اور علمی تھا، لیکن اس میں کبھی کبھی اسلامی عقائد سے متعلق اشتعال انگیز مضامین بھی شایع ہوا کرتے تھے، جن سے علماء اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کے طبقہ میں بڑی برہمی پھیل جاتی تھی، یہاں تک کہ ایک موقع ایسا بھی آیا کہ مجبوراً رسالہ کے مدیر کے خلاف عدالتی کارروائی بھی کی گئی، جس کے بعد ان کو باضابطہ توبہ نامہ لکھنا پڑا، مگر ان کی کج روی پھر بھی جاری رہی۔

اسی سلسلہ میں ۱۹۳۱ء میں اسی رسالہ میں "بعض عقائد اسلامی کے کمزور ماخذ" کے عنوان سے ایک مضمون شایع ہوا، جس میں حضرت ابوہریرہؓ پر گستاخانہ حملہ کرکے ان کو تاریخی اور اخلاقی حیثیت سے گرانے اور حدیث میں ان کی روایتوں کو مجروح اور رد کرنے کی کوشش کی گئی۔

شاہ صاحب اپنی مہاجرین جلد دوم میں حضرت ابوہریرہؓ کے حالات لکھنے میں ان کا گہرا مطالعہ کر چکے تھے، اس لیے مذکورۂ بالا مضمون کو پڑھ کر ان کی رگ حمیت پھڑک اٹھی، اور اس کا جواب معارف کے ۴۲ صفحے میں دے کر یہ ثابت کیا کہ اس محترم ہستی کو ساقط الاعتبار قرار دینے کے لیے تدلیس، کذب، مغالطہ اور اس قبیل کا کوئی ایسا حربہ نہیں ہے جو استعمال نہ کیا گیا ہو، پھر مضمون نگار کی وسعت نظر اور سخن فہمی کا پردہ فاش کرکے یہ دکھایا کہ شروع سے آخر تک مضمون کا ایک لفظ بھی صحیح نہیں۔

شاہ صاحبؒ نے پہلے تو اس کا تجزیہ کیا ہے کہ اس قسم کے مضامین لکھنے میں کیا جذبہ کارفرما ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اس قسم کی تحریریں ایسے ہی لوگوں کے قلم سے نکلتی ہیں جو عیسائی مشنریوں اور یورپ کے مستشرقوں کے مخالف اسلام خیالات کو پڑھ کر ان کو تمام تر وحی والہام سمجھنے لگتے ہیں، اور ان ہی معلومات کو لے کر عام مسلمانوں کے سامنے اپنی تحقیقات علمیہ کی صورت میں پیش کرکے خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے اسلام کی تجدید و اصلاح کا کام کیا، اس سلسلہ میں شاہ صاحب کا یہ سوال تھا کہ ان نامسلمانوں کی یہ دماغی غلامی کیا ان ائمہ مجتہدین، محدثین، تابعین اور صحابہؓ کی تقلید و اتباع سے بہتر ہے جنھوں نے اپنی زندگیاں اسلام و رسول اسلام علیہ السلام کے احکام و پیام کی تبلیغ و اشاعت میں صرف کیں؟ آج بھی ایسے نامسلمان ہیں جو اس قسم کے مضامین لکھ کر مارتن اسلام کے لوتھر بننا چاہتے ہیں، ان سے بھی یہی سوال کیا جاسکتا ہے۔

شاہ صاحبؒ کے خیال کے مطابق حضرت ابوہریرہؓ کو جو صحابہؓ کے زمرہ میں سب سے زیادہ کثیر الروایت ہیں، مذکورۂ بالا مضمون میں مشق ستم اس لیے بنایا گیا ہے کہ گلشن اسلام کے باغبانوں ہی کو مجروح کرکے روز روز کے مذہبی مناظروں کا قصہ ختم کر دیا جائے کہ جب صحابہؓ ہی جو قصر اسلام کے اساطین ہیں گرا دیے جائیں گے تو مذہب کی بوسیدہ عمارت خود بخود منہدم ہو جائے گی، اس طرح حدیث کا دفتر بے پایاں بھی ناقابل اعتبار قرار پائے گا، اور جب حدیثیں ناقابل اعتبار ہو جائیں گی تو من مانی تاویلوں کے لیے دروازہ

کھل جائے گا، شاہ صاحب ایسے مضمون نگاروں کو مخاطب کرکے لکھتے ہیں :

اگر گیتی سراپا باد گیرد چراغِ مقبلاں ہرگز نمیرد

شاہ صاحب نے مضمون نگار کے ہر اعتراض کا مدلل جواب دیا ہے، مضمون نگار کا یہ اعتراض بھی تھا کہ وہی حدیث قابل قبول ہو سکتی ہے جو ہماری عقل کے مطابق ہو، اس کا جواب شاہ صاحب نے یہ دیا :

"بعض احادیث بلاشبہ ایسی ہیں جو ہماری محدود عقل و فہم سے باہر ہیں، ان میں انفرادی عقول کو معیار قرار دینا صحیح نہیں کہ انسانوں کی عقلیں باہم متفاوت ہوتی ہیں، بہت ممکن ہے کہ ایک شے کسی خاص انسان کی عقل کے مخالف ہو، لیکن وہی شے دوسرے آدمی کی فہم کے عین مطابق ہو، اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ ہر رطب و یابس کو جو حدیث کے نام سے مشہور ہو، بلا چون و چرا تسلیم کر لیا جائے، اور عقل کو مطلق دخل نہ دیا جائے، محدثین نے خود اصول نقد میں عقل کو ملحوظ رکھا ہے کہ جو حدیث عقل صریح کے خلاف ہو وہ ناقابل قبول ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کسی حدیث کے کسی خاص انسان کی عقل کے نزدیک خلاف عقل ہونے اور واقعۃً خلاف ہونے میں فرق ہے، اس لیے انفرادی عقول کے بجائے عقل عمومی کا لحاظ رکھنا چاہیے"

شاہ صاحبؒ نے اس سلسلہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ

"عقل میں بھی اسی عقل کو معیار نہ بنانا چاہیے جسے یورپ نے پیش کیا ہے، بلکہ کچھ اپنی گرہ کی عقل، اپنے مذاق، اپنی روایات اور اپنی خصوصیات کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے، اسی اندھی تقلید کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں کو یورپ ہی کی لگائی ہوئی عینک سے دیکھتے ہیں، بلکہ اسی کے دل و دماغ سے سوچتے اور سمجھتے ہیں، چنانچہ آج مذہب کے خلاف اس کی اصلاح کے پردہ میں جتنی آوازیں بلند ہو رہی ہیں وہ سب اسی کی صدائے بازگشت ہیں۔"

پھر شاہ صاحبؒ ایسے یورپ زدہ مضمون نگاروں کو جو قرآن مجید کو تحریفات اور احادیث و سنن کو موضوعات قرار دے کر اسلام کی تجدید و اصلاح کا دعویٰ کرنے والوں کو مخاطب کرکے لکھتے ہیں :

"ہمارے جدید مصلحین امت یہ نہیں سمجھتے کہ اگر یورپ عیسائیت کی مخالفت پر آمادہ ہو رہا ہے تو بجا ہے کہ وہ اس بیسویں صدی کے دور ترقی کا ساتھ نہیں دے سکی اور دور حاضر کی رہنمائی سے قاصر ہے، لیکن اسلام تو ایک ترقی یافتہ اور ابدی مذہب ہے، جو انسانی زندگی کے ہر دور میں خواہ کتنا ہی بلند اور ترقی یافتہ کیوں نہ ہو اس کا ہادی اور رہنما اور اس کی تمام دنیوی اور اخروی ضروریات کا کفیل ہے، کیا یہ قرین دانشمندی ہے کہ محض اس ریس میں کہ چونکہ یورپ اپنے اس ناقص مذہب کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا ہے جو اس کی موجودہ ترقی میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتا، ہم بھی اپنے دین کامل کی بیخ کنی پر آمادہ ہو جائیں، ہم کو تو اسلام کے سراج منیر کی روشنی میں خود یورپ کو راہ دکھانی چاہیے، نہ کہ الٹے اپنی اس شمع ہدایت پر پھونک ماریں"

شاہ صاحبؒ نے یہ تحریر آج سے پچاس برس پہلے لکھی تھی، لیکن ان کا یہ پیام اب بھی تمام اسلامی ممالک کے ان مصلحین کے لیے ہے جو اسلام کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے اس میں یورپ کے طرز فکر کے مطابق تجدید و اصلاح چاہتے ہیں۔

آخر میں شاہ صاحبؒ مضمون نگار جیسے منکرین حدیث و سنت نبویؐ کو سامنے رکھ کر رقمطراز ہیں :

"وحی الٰہی اور سنت نبویؐ یہ دونوں چیزیں باہم لازم و ملزوم ہیں، ایک کو چھوڑنے سے دوسری کبھی زندہ نہیں رہ سکتی، ان دونوں کا رشتہ ایسا ہی ہے جیسے قانون اور ضوابط کا، کہ ضابطوں کے علم کے بغیر قانون پر عمل کرنا مشکل بلکہ محال ہے، اور قانون کے بغیر تنہا ضابطے بیکار ہیں"

شاہ صاحبؒ کے اس ایجاز میں اطناب کا ایک دریا اپنی بے پناہ موجوں کے ساتھ لہرا رہا ہے۔

سیر الصحابہؓ جلد ششم

۱۹۳۲ء میں شاہ صاحب کی دوسری تصنیف سیر الصحابہؓ، جلد ششم شائع ہوئی، ان کی

اس کتاب کا ماخذ مسند احمد بن حنبل، طبقات ابن سعد، بخاری، مسند دارمی، مستدرک حاکم، ابوداؤد، تہذیب الکمال، اصابہ، تہذیب التہذیب، سیرت ابن ہشام، اسد الغابہ، فتوح البلدان بلاذری، ابن عساکر، استیعاب، اعلام الموقعین، اخبار الطوال، زاد المعاد، ابن اثیر، مسلم کتاب الجہاد، فتح الباری، اصابہ، موطا امام مالک، طبری، تاریخ الخلفا سیوطی، مروج الذہب مسعودی، یعقوبی، معارف ابن قتیبہ، البدایۃ والنہایۃ، کتاب العمدہ، تہذیب الاسماء واللغات نودی، ترمذی، الفخری، حسن المحاضرۃ سیوطی، وفاء الوفاء، خلاصۃ الوفاء، مقریزی، ابن کثیر، ابن خلدون، منہاج السنۃ، الریاض النضرۃ فی مناقب العشرۃ، لسان المیزان۔

ان ماخذوں کی فہرست سے اندازہ ہوگا کہ شاہ صاحبؒ کا مطالعہ حدیث، طبقات، تاریخ، اور رجال پر کافی ہو چکا تھا، جو برابر بڑھتا گیا۔

اس میں حضرت امام حسنؓ، امیر معاویہؓ، امام حسینؓ اور عبد اللہؓ بن زبیر کے حالات ہیں، جن میں بہت سے متنازعہ فیہ واقعات ہیں، مگر شاہ صاحبؒ اپنے قلم کی سلامت روی سے ان کو قلمبند کرنے میں بہت ہی خوبی سے عہدہ برآ ہوئے ہیں، حضرت امام حسنؓ کے بارے میں مشہور رہا ہے کہ انھوں نے بکثرت شادیاں کیں، اور اسی کثرت سے طلاقیں دیں، بعض روایتوں میں ان کے ازواج کی تعداد نوّے ۹۰ تک پہونچ جاتی ہے لیکن شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ اس کی تردید اس سے ہوتی ہے کہ آپ کی کل دس ۱۰ اولادیں تھیں، یہ تعداد شادیوں کی تعداد کے مقابلہ میں بہت کم ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شادیوں کی کثرت کی روایت مبالغہ سے خالی نہیں ہے، تاہم اس قدر مسلّم ہے کہ عام رواج سے زیادہ شادیاں کیں، اس کثرت ازدواج و طلاق کو دیکھ کر حضرت علیؓ نے کوفہ میں اعلان کر دیا تھا کہ انھیں کوئی لڑکی نہ دے، اس کے باوجود بقول شاہ صاحبؒ عام مسلمانوں میں خانوادۂ نبوی سے رشتہ پیدا کرنے کا شوق اتنا غالب تھا کہ حضرت علیؓ کی اس مخالفت کا کوئی اثر نہ ہوا، اور ایک ہمدانی نے برملا کہا کہ ہم ضرور لڑکی دیں گے، زیادہ سے زیادہ یہی نہ ہوگا کہ جو عورت انہیں پسند ہوگی رکھ لیں گے، ورنہ طلاق دے دیں گے، شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ جب تک کوئی عورت آپ کے

حبالۂ عقد میں رہتی تھی اس سے بڑی محبت اور اس کی بڑی قدر افزائی فرماتے تھے، جب ناگزیر اسباب کی بنا پر کسی عورت سے قطع تعلق کرتے تھے تو آپ کے حسن سلوک اور محبت کی یاد اس کے دل میں برابر رہتی تھی، ایک مرتبہ ایک فزاری اور ایک اسدی عورت کو رجعی طلاق دی، ان کی دلدہی کے لیے دس دس ہزار نقد اور ایک مشکیزہ شہد بھیجا اور ملازم کو ہدایت کر دی کہ اس کے جواب میں وہ جو کچھ کہیں اس کو یاد رکھنا، فزاری عورت کو جب خطیر رقم ملی تو اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لی اور بارک اللہ فیہ وجزاہ خیرا کہا، لیکن جب اسدی عورت کو ملی تو یہ تحفہ دیکھ کر اس کے دل پر چوٹ لگی اور بے اختیار حسرت بھرا فراقیہ مصرع اس کی زبان سے نکلا، جس کا مطلب یہ تھا کہ جدا ہونے والے دوست کے مقابلہ میں یہ متاع حقیر ہے۔ (ص ۱۷ - ۱۸)

اس موثر واقعہ کے ساتھ شاہ صاحبؒ کے انداز بیان پر بھی غور کیجیے۔

حضرت امام حسنؓ سے متعلق یہ بھی روایت ہے کہ حضرت علیؓ کی وفات کے بعد مسلمانوں نے آپ سے بیعت کی اور آپ مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوئے، مگر کچھ مہینوں کے بعد اپنی کمزوری کی بنا پر خلافت سے امیر معاویہؓ کے حق میں دستبردار ہوگئے، مگر شاہ صاحبؒ نے مدلل طریقہ پر ثابت کیا ہے کہ آپ نے کمزوری کی بنا پر دستبرداری اختیار نہیں کی، بلکہ آپ کو یقین ہوگیا تھا کہ ہزاروں مسلمانوں کے خاک و خون میں تڑپے ہوئے بغیر کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا، جنگ جمل سے برابر مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہتی چلی آ رہی ہیں، اس لیے آپ نے اسے روکنے کے لیے خلافت کو یہ کہہ کر مدینہ کی عزلت نشینی اختیار فرمائی (ص ۲۶) اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ ظاہر ہو گیا کہ میرا یہ لڑکا سید ہے، خدا اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کے دو فریقوں میں صلح کرائے گا (ص ۲۴ - ۲۵)

اگر امام حسنؓ کے اس اسوہ کی پیروی مسلمانوں کا حکمراں طبقہ برابر کرتا رہتا تو آیندہ چل کر ان کی بنی بنائی، بچی بچائی سلطنتیں ختم نہ ہوتیں، اور نہ ان فتوحات سے محروم ہوتے جن کو اپنی پامردی اور سپہگری سے تو حاصل کرتے مگر اس کے بعد ہی باہمی نفاق و آویزش اور خانہ جنگی میں مبتلا ہو جاتے، شاہ صاحبؒ نے

حضرت امام حسنؓ کے علم و فضل اور شان خطابت کے علاوہ ان کے اخلاق و عادات، استغنا و بے نیازی، اصلاحِ عقائد، عبادت، ضبط و تحمل، صدقات و خیرات کی جو مرقع آرائی کی ہے، وہ نہ صرف مسلمانوں کی سیرت بلکہ انسانیت کو سنوارنے کے لیے مشعل راہ ہے، شاہ صاحبؒ امام حسنؓ کی وفات کے سلسلہ میں لکھتے ہیں: ۵۰ھ میں آپ کی بیوی جعدہ بنت اشعث نے کسی وجہ سے زہر دے دیا، سم قاتل تھا، قلب و جگر کے ٹکڑے کٹ کٹ کر گرنے لگے، جب حالت زیادہ نازک ہوگئی اور زندگی سے مایوس ہوگئے تو حضرت حسینؓ کو بلا کر ان سے واقعہ بیان کیا، انھوں نے زہر دینے والے کا نام پوچھا، فرمایا نام پوچھ کر کیا کروگے، عرض کیا: قتل کردوں گا، فرمایا اگر میرا خیال صحیح ہے تو خدا بہتر بدلہ لینے والا ہے، اور اگر غلط ہے تو میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کوئی ناکردہ گناہ پکڑا جائے، پھر زہر دینے والے کا نام بتانے سے انکار کردیا۔ (ص ۱۴۰) عفو و درگذر، رحم و کرم ضبط و تحمل کی اس سے اعلیٰ تر مثال کہاں مل سکتی ہے۔ ایسے واقعات کو قلمبند کرنے میں شاہ صاحبؒ کے قلم نے ان کی بڑی مدد کی۔

امیر معاویہؓ کے حالات لکھنا آسان نہیں، بلکہ پل صراط پر چلنے سے زیادہ مشکل ہے، اگر شاہ صاحبؒ کا قلم اس پل صراط پر سے بڑی خوبی سے گذر گیا ہے، شاہ صاحبؒ کو اس کا اعتراف ہے کہ امیر معاویہؓ کا حضرت علیؑ کے مقابلہ میں صف آرا ہونا، اپنی کامیابی کے لیے ہر طرح کے جائز و ناجائز وسائل استعمال کرنا، حضرت حسنؓ سے لڑنا، اسلامی خلافت کو موروثی حکومت میں بدل دینا وغیرہ، ان میں سے ہر ایک واقعہ ان کی ایسی کھلی غلطی ہے جسے کوئی حق پسند مستحسن نہیں قرار دے سکتا، خصوصاً یزید کی ولی عہدی سے اسلامی خلافت کی روح ختم اور اسلام میں موروثی بادشاہت کی رسم قائم ہوگئی، ان واقعات سے عوام کے ساتھ حق پسند خواص بھی ان سے بدظن ہوگئے۔ (ص ۹۲۔۹۳)

لیکن اسی کے ساتھ امیر معاویہؓ میں جو غیر معمولی اوصاف تھے ان کو شاہ صاحبؒ نے نظر انداز نہیں کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ان میں بے نظیر تدبر، سیاست اور قوت نظم تھی، ان کی حکومت ترقی یافتہ

حکومت کا ایک مکمل اور جامع نمونہ تھی، ان کے بعد کے آنے والے خلفاء کا دور بعض انفرادی اوصاف و خصوصیات میں تو ان کے دور سے ممتاز رہا، لیکن مجموعی حیثیت سے ان سے کوئی بڑھ نہ سکا، (ص ۷۵)

وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حنین اور طائف کے غزوات میں بھی شریک ہوئے، کاتب وحی بھی بنے، حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں شام کی فتوحات میں شریک رہے، عرفہ انہی کی کوششوں سے فتح ہوا، حضرت عمرؓ کے آخر عہد خلافت میں رومیوں نے شام کے بعض مقامات واپس لے لیے تو معاویہؓ نے ان کو زیر کرکے دوبارہ زیر نگیں کیا، حضرت عمرؓ نے قیساریہ کی مہم ان کے سپرد کی تو رومیوں کو شکست فاش دی، حضرت عمرؓ ان کے تدبر و سیاست اور علوئے حوصلہ کی وجہ سے ان کو کسرائے عرب کے لقب سے یاد کرتے تھے، ان کو اپنے عہد میں دمشق کا عامل بنایا، جہاں وہ چار سال تک رہے، حضرت عثمانؓ نے تو ان کو پورے شام کا والی بنا دیا تھا، ان ہی کی فوجی کارروائیوں کی وجہ سے طرابلس الشام، شمشاط، ملطیہ اور قبرص فتح ہوئے (ص ۴۲) وہ بحر روم کو عبور کرتے ہوئے تنگنائے قسطنطنیہ تک پہونچ گئے تھے (ص ۴۴) پھر جب حکمراں بنے تو نہ صرف مفتوحہ علاقوں کی بغاوتوں اور شورشوں کو کچل کر رکھ دیا بلکہ ان کے عہد میں بست، زران، رخج، غزنہ، رامنی، نسف، بیکند، بخارا، سمرقند، سندھ، روڈس اور ارواڈ وغیرہ فتح ہوئے، کوئی سال رومیوں سے نبرد آزمائی سے خالی نہیں جاتا، ہر موسم گرما میں مسلمان کبھی ایشیا اور کبھی یورپ میں ان سے مقابلہ کرتے تھے، امیر معاویہؓ کے عہد میں بحر روم کے متعدد جزیرے اسلام کے زیر نگیں ہوئے، اس طرح ان کی حکومت کے ماتحت ایشیا میں ترکستان سے سندھ کے علاقے اور افریقہ میں تونس، مراکش اور الجزائر بھی تھے، اسی کے ساتھ حکام کے انتخاب میں بڑی فراست کا ثبوت دیتے رہے، جس سے حکومت خاطر خواہ طریقہ پر چلتی رہی، فوجی نظام کو ترقی دے کر کمال تک پہونچا دیا (ص ۷۸) جبلۃ الطرطوس، مرقیہ، بلنیاس، روڈس اور مدینہ میں بڑے بڑے قلعے بنائے، بحری فوج کو اتنی ترقی دی کہ اسلامی بیڑے کو اس عہد کے مشہور رومی بیڑوں سے بڑھا دیا،

جہاز سازی کے کارخانے مصر، اردن اور عکا میں قائم کیے، اندرون ملک پولیس کا بڑا اچھا انتظام کیا، مشتبہ لوگوں پر نگرانی رکھنے کا اہتمام کیا، خبر رسانی اور پرچہ نگاری کو پہلے سے زیادہ ترقی دی، زراعت کی ترقی کے لیے نہر کظامہ، نہر ازرق، نہر شہدا کھدوائی، شام میں شہر مرعش، افریقہ میں شہر قیروان، انطاکیہ میں فارس، بعلبک، حمص آباد کیے، اسی لیے تمام مورخین ان کو اپنے زمانہ کا سب سے بڑا مدبر، سیاست داں اور بیدار مغز فرماں روا مانتے تھے، (ص ۱۲۳) ان تمام واقعات کا ذکر کرکے خود شاہ صاحب اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ سیاست، تدبر، حکومت و فرماں روائی، جہاں بانی و کشور کشائی کے اوصاف جلیلہ میں ان کا کوئی معاصر ان کا حریف نہ تھا (ص ۱۳۵)

اسی کے ساتھ ان کے اور فضائل بیان کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ رقمطراز ہیں کہ انھوں نے اپنا دامن علم اتنا وسیع کر لیا تھا کہ وہ صحابہؓ جو اپنے فضل و کمال کے لحاظ سے حبر الامۃ کہلاتے تھے، ان کو فقہاء میں شمار کرتے تھے (ص ۱۳۰) احادیث نبویؐ کا کافی ذخیرہ ان کے سینہ میں محفوظ تھا، کتابت میں ان کو پوری مہارت تھی، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنا خاص کاتب مقرر فرمایا تھا (ص ۱۳۱، ۳۰) وہ شعر و شاعری کا نہایت اچھا مذاق رکھتے تھے (ص ۱۳۱) ان کی تقریر بلاغت اور زور بیان کا عمدہ نمونہ ہوتی تھی (ص ۱۳۱)

قیامت کے مواخذہ کا ذکر سن کر لرزہ براندام ہو جاتے تھے، روتے روتے ان کی حالت غیر ہو جاتی تھی (ص ۱۳۹) ان میں ضبط و تحمل بھی بہت تھا، تلخ سے تلخ اور ناگوار سے ناگوار بات میں شربت کی طرح پی جاتے تھے، اور کہتے کہ غصہ پی جانے سے زیادہ میرے لیے کوئی شے لذیذ نہیں (ص ۱۳۹) فیاضی اور زر پاشی بھی ان کا خاص وصف تھا، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن جعفرؓ اور آل ابی طالب ان کے شدید مخالفوں میں تھے، لیکن ان کی مخالفت اور ان کی بدکلامیوں کے باوجود وہ ان کے ساتھ سلوک کرتے تھے (ص ۱۴۱) وہ حضرت عائشہؓ کی بڑی خدمت کرتے رہے، ان کی خدمت میں ایک لاکھ کی

نذر پیش کرتے تھے، وقتاً فوقتاً پانچ پانچ ہزار کی رقمیں بھی بھیجیں (ص ۱۴۲) ان کے پاس آثار نبویؐ میں ایک کرتہ، ناخن اور موئے مبارک تھے، وفات کے وقت وصیت کی کہ اس کرتے میں مجھے کفنانا، ناخن اور موئے مبارک آنکھوں اور منھ کے اندر بھر دینا، شاید اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے مغفرت فرمائے (ص ۱۴۲)

امیر معاویہؓ کے یہ تمام محاسن و اوصاف شاہ صاحب نے مستند ماخذوں کے سہارے بڑی وضاحت کے ساتھ قلمبند کیے ہیں، پھر ان کو اپنی کتاب میں وہ درجہ کیوں نہ دیتے، جو ان کو فرماں روائی کی تاریخ میں حاصل تھا، اور جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔

ان پر جو الزامات ہیں، شاہ صاحبؒ نے ان کا بھی تجزیہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ سے جو ٹکر لی اور یزید کو جو اپنا جانشین بنایا اس سے ان کے بہت سے مخالفین پیدا ہو گئے اور ان کی طرف بہت سی برائیاں منسوب کیں، بنی عباس ان کے سخت دشمن تھے، اس لیے ان کے زمانے میں ان کے خلاف نفرت انگیز خیالات پیدا کیے گئے، بہت سی غلط روایتیں زبانوں پر چڑھ گئیں، اور تاریخوں میں بھی داخل ہو گئیں، کچھ تو بعد میں تنقید سے مسترد ہو گئیں، پھر بھی کچھ باقی رہ گئیں، جن میں کچھ یہ ہیں:

حضرت حسنؓ کے زہر دلوانے میں ان ہی کا ہاتھ تھا، ان کا طرز عمل بنی ہاشم اور اہل بیت نبویؐ کے ساتھ ناپسندیدہ تھا، حضرت علیؓ پر سب و شتم کرتے تھے، بعض صحابہ کو قتل کیا اور ان کی توہین کی، ان کا طرز حکومت نہایت جابرانہ تھا، انھوں نے بیت المال کو ذاتی خزانہ بنا لیا تھا، حکومت کے تمام شعبوں میں بنی امیہ کو بھر دیا تھا، بہت سی بدعتیں جاری کیں، شاہ صاحبؒ نے ان تمام الزامات پر بڑی مدلل بحثیں کی ہیں، اور پورے دلائل کے ساتھ مستند ماخذوں کے حوالے سے ان کو رد کیا ہے، میرا خیال یہ ہے کہ یہ مباحث ان کی تحقیقی کاوشوں کا بڑا عمدہ نمونہ ہیں۔

حضرت حسنؓ کی زہر خورانی کے واقعہ کے سلسلہ میں حدیث، طبقات اور تاریخ کی تمام کتابوں کی

چھان بین جس طرح کی ہے ان کو پڑھ کر ناظرین ضرور محظوظ ہوں گے۔

امیر معاویہؓ کی جابرانہ حکومت کی تردید بھی سعید بن العاصؓ کی یہ روایت نقل کر کے کر دی کہ امیر معاویہؓ کہتے تھے کہ جہاں میرا کوڑا کام دیتا ہے وہاں تلوار کام میں نہیں لاتا، اور جہاں زبان کام دیتی ہے وہاں کوڑا کام میں نہیں لاتا، اگر میرے اور لوگوں کے درمیان بال برابر بھی رشتہ قائم ہو تو میں اس کو نہ توڑوں گا۔ لوگوں نے پوچھا: امیر المومنین! یہ کس طرح؟ جواب دیا: لوگ اس کو کھینچتے ہیں تو وہ ڈھیل دیتے ہیں، اور جب وہ ڈھیل دیتے ہیں تو میں کھینچ لیتا ہوں، اور جب کسی آدمی کی کوئی ناگوار بات معلوم ہوتی ہے تو انعام واکرام سے اس کی زبان بند کر دیتا ہوں (ص ۱۱۸ - ۱۱۷) یہ حکمرانی کا ایسا اصول ہے کہ آج بھی بیدار مغز حکمراں اسی پر عمل کرتے ہیں، شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امیر معاویہؓ کے یہاں بھی حلم اور سختی دونوں تھی، اس کی تصدیق علامہ ابن طقطقی کے اس بیان سے کرتے ہیں کہ امیر معاویہؓ حلم کے موقع پر حلم سے اور سختی کے موقع پر سختی سے کام لیتے لیکن حلم کا پہلو غالب تھا۔ (ص ۱۱۸)

شاہ صاحبؒ نے امیر معاویہؓ کا کردار دکھانے میں جو دو روایتیں بیان کی ہیں، وہ ضرور قابل غور ہیں، عبداللہ بن مسعدہ بن حکم فزاری بیان کرتے ہیں کہ امیر معاویہؓ شام کے کسی علاقہ میں جا رہے تھے، تو انھوں نے ان سے مخاطب ہو کر کہا: ابن مسعدہ! خدا ابو بکرؓ پر رحم کرے، نہ انھوں نے دنیا کو چاہا، نہ دنیا نے انھیں چاہا، عمرؓ کو دنیا نے چاہا، لیکن انھوں نے اس کو نہیں چاہا، عثمانؓ کو کچھ دنیا میں مبتلا ہونا پڑا، اور ہم لوگ تو بالکل اس میں مبتلا ہو گئے، یہ کہہ کر نادم ہو گئے، پھر کہا: خدا کی قسم! یہ حکومت بھی خدا ہی نے ہم کو دی ہے (ص ۱۳۹) حضرت مسور بن مخرمہؓ کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ معاویہؓ کے پاس گیا تو انھوں نے کہا کہ تم کیوں مغفرت خداوندی کے مجھ سے زیادہ مستحق ہو؟ خدا کی قسم ایسی حالت میں جب کہ اصلاح بین الناس، اقامت حدود، جہاد فی سبیل اللہ اور بڑے بڑے بیشمار امور کا بار میرے کندھوں پر ہے جو تمھارے اوپر نہیں ہے، اور میں خدا کے دین پر ہوں، جو بھلائیوں کو قبول کرتا ہے اور برائیوں سے درگذر کرتا ہے، اس پر بھی خدا کی قسم اگر میرے سامنے خدا اور اس کے ماسوا کا سوال آتا ہے تو میں خدا ہی کو اختیار کرتا ہوں، مسورؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد جب معاویہؓ کا ذکر آتا تو ان کے لیے وہ دعائے خیر کرتے تھے (ص ۱۲۶)

امیر معاویہؓ کے کردار کے ان پہلوؤں کو شاہ صاحب نے جس طرح پیش کیا ہے اس سے ان کی سوانح نگاری کی بصیرت کا بھی اندازہ ہوگا۔

اس کتاب میں امیر معاویہؓ کے بعد حضرت امام حسینؓ بن حضرت علیؓ کا باب ہے، جو اس لحاظ سے اہم ہے کہ اب تک ان کے حالات شہادت ناموں اور مرثیوں میں پڑھے جاتے تھے، جن میں زیادہ تر روایتیں جذباتی ہیں، اس لیے ناقابل قبول ہوتی تھیں، مگر شاہ صاحب نے ان کو مستند ماخذوں اور معتبر حوالوں سے قلمبند کر کے ایک بڑی علمی خدمت انجام دی ہے، شاہ صاحبؒ کو حضرت حسینؓ سے وہی عقیدت ہے جو ایک سچے مسلمان کو ہونا چاہیے، اس لیے جب ان کی ولادت باسعادت کا ذکر کرتے ہیں تو لکھتے ہیں:

"ریاض نبویؐ میں وہ خوش رنگ ارغوانی پھول کھلا جس کی مہک حق و صداقت، جرأت و بسالت، عزم و استقلال، ایمان و عمل اور ایثار و قربانی کی وادیوں کو ابد الآباد تک بساتی اور حسن کی رنگینی عقیق کی سرخی، شفق کی گلگونی اور لالہ کے داغ کو شرماتی رہے گی، یعنی ۴ھ میں علیؓ کا کاشانہ حسینؓ کے تولد سے رشک گلزار بنا۔" (ص ۱۳۶ - ۱۳۵)

شاہ صاحبؒ کی تحریر کی یہ شگفتگی ان کی تصنیفی زندگی کے ابتدائی دور کی تھی، جو برابر بڑھتی گئی، آخر میں اس شگفتگی میں ایسی پختگی پیدا ہوئی کہ پختگی شگفتگی پر غالب آگئی۔

کربلا کا واقعہ اسلام کی تاریخ کا المناک ترین سانحہ ہے، اس کو یاد کر کے کون مسلمان ہے جو خون کے آنسو نہ روتا ہوگا، شاہ صاحبؒ بھی اس کے ذکر کرنے میں بیحد سوگوار ہوئے ہیں، ان کے قلم میں طاقت تھی اس لیے اپنی سوگواری کا اظہار بہت موثر طریقہ پر کیا ہے، پہلے تو حضرت امام حسینؓ کی بے کسی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

"اللہ اللہ! یہ بھی نیرنگی دہر اور انقلاب زمانہ کا کیسا عجیب اور کیسا عبرتناک منظر ہے کہ جس کے نانا کے گھر کی

پاسبانی ملائکہ کرتے تھے آج اس کا نواسہ بے برگ و نوا بے یار و مددگار کربلا کے دشتِ غربت میں گھرا ہے، اور روئے زمین میں خدا کے علاوہ اس کا کوئی حامی و مددگار نہیں، غزوۂ بدر میں جس کے نانا کی حفاظت کے لیے آسمان سے فرشتے اترے تھے آج اس کے نواسہ کو ایک انسان بھی محافظ نہیں ملتا"

پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت، عفو و کرم اور درگذر کا حوالہ اس طرح دیتے ہیں:

"ایک وہ وقت تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار قدسیوں کے ساتھ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تھے، دشمنانِ اسلام کی ساری قوتیں پاش پاش ہو چکی تھیں، رحمتِ عالمؐ کے دامن عفو و کرم کے علاوہ ان کے لیے کوئی جائے پناہ باقی نہیں رہ گئی تھی، اسلام اور مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ابوسفیان جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے ساتھ بغض و عداوت، دشمنی و کینہ پروری کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا، بے بس و لاچار دربارِ رسالت میں حاضر کیے گئے تھے، ایک طرف ان کے جرائم کی طویل فہرست تھی، دوسری طرف رحمۃ للعالمین کی شانِ رحمت و کرم، تاریخ کو معلوم ہے کہ سرکارِ رسالت سے اس سنگین اور اشتہاری مجرم کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا تھا، قتل کی دفعہ عائد نہیں کی گئی، جلا وطنی کی سزا تجویز نہیں ہوئی، قید خانہ کی چار دیواری میں بند نہیں کیا گیا، بلکہ "من دخل دار ابی سفیان فھو امن" جو شخص ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے اس کی جان و مال محفوظ ہے' کے اعلان کرم سے نہ صرف تنہا ابوسفیان کی جان بخشی فرمائی گئی، بلکہ ان کے گھر کو جس میں بارہا مسلمانوں کے خلاف سازشیں ہو چکی تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے مشورے ہو چکے تھے، دار الامن بنا کر وما ارسلناک الا رحمۃ للعٰلمین کی عملی تفسیر فرمائی گئی (ص ۲۱۴)

اس کے بعد حضرت امام حسینؓ کی شہادت سے پہلے کا منظر دکھانے میں شاہ صاحبؒ کا قلم کچھ اور طاقتور ہو جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"ٹھیک باون برس کے بعد زمانہ کا رخ بدلتا ہے، اور ایک دوسرا منظر سامنے آتا ہے، ایک طرف انہی ابوسفیان کے پوتے عبید اللہ بن زیاد کی طاغوتی طاقتیں ہیں، دوسری طرف رحمۃ للعالمین کی تمام ذریت اولاد ہے، نبوت کا سارا کنبہ ابوسفیان کی ذریات کے ہاتھوں تہ تیغ ہو چکا ہے، کربلا کا میدان اہلبیت کے خون سے لالہ زار بنا ہوا ہے، جگر گوشۂ رسولؐ کی آنکھوں کے سامنے گھر بھر کی لاشیں تڑپ رہی ہیں، اعزہ کے قتل پر آنکھیں خوں بار ہیں، بھائیوں کی شہادت پر سینہ وقفِ ماتم ہے، جواں مرگ لڑکوں اور بھتیجوں کی موت پر دل فگار ہے، لیکن اس حالت میں بھی وحوش و طیور کے لیے امان ہے، مگر جگر گوشۂ رسولؐ کے لیے امان نہیں — آج وہی تلواریں جو فتح مکہ میں مفتوحانہ ٹوٹ چکی تھیں، دشت کربلا میں نوجوانانِ اہل بیت کا خون پی کر سیر نہیں ہوئیں، حسینؓ کے خون کی پیاس میں زبانیں چاٹتی ہیں، لیکن پیکرِ صبر و قرار اس حالت میں بھی راضی برضا ہیں، اور اس بے بسی میں بھی جادۂ مستقیم سے پاؤں نہیں ڈگمگاتے"

(ص ۲۱۵ - ۲۱۴)

امام حسینؓ کی شہادت کے ذکر میں شاہ صاحبؒ کا قلم بہت ہی خوں چکاں ہو گیا ہے، اس خوں چکانی کو سہارا ان کی قوتِ تحریر سے اچھی طرح ملا ہے، جس میں شبلی اسکول کا رنگ پورے طور پر نمایاں ہے، امام حسینؓ کے آخری وقت کی مرقع آرائی اس طرح کی گئی ہے:

"حضرت حسینؓ کی حالت لحظہ بہ لحظہ غیر ہوتی جاتی تھی، زخموں سے سارا بدن چور ہو چکا تھا، لیکن کسی کو شہید کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی، سب اس جبل معصیت کو ایک دوسرے پر ٹال رہے تھے، شمر نے یہ تذبذب دیکھ کر پکارا، تمھارا برا ہو تمھاری مائیں تم لڑکوں کو روئیں، دیکھتے کیا ہو، بڑھ کر حسینؓ کو قتل کر دو، اس للکار پر شامی چاروں طرف سے امامؓ ہمام پر ٹوٹ پڑے، ایک شخص نے تیر مارا، جو گردن میں آ کر بیٹھ گیا، امامؓ نے اس کو ہاتھوں سے نکال کے الگ کیا، ابھی آپ نے تیر نکالا ہی تھا کہ زرعہ بن شریک تمیمی نے بائیں ہاتھ پر تلوار ماری، پھر گردن پر وار کیا، ان پیہم زخموں نے امامؓ کو

بالکل نڈھال کر دیا، اعضاء جواب دے گئے" اور کھڑے ہونے کی طاقت باقی نہ رہی، آپ اٹھتے تھے اور سکت نہ پاکر گر پڑتے تھے، عین اسی حالت میں سنان بن انس نے کھینچ کر ایسا کاری نیزہ مارا کہ فلک امامت زمیں بوس ہوگیا، سنگ دل اور شقی ازلی خولی ابن یزید سر کاٹنے کے لیے آگے بڑھا، لیکن ہاتھ کانپ گئے، تھرا کے پیچھے ہٹ گیا، سنان بن انس نے اس سر کو جو بوسہ گاہ سرور کائنات تھا جسم اطہر سے جدا کر لیا۔" (ص ۲۵۲)

اس نثر نگاری میں ایک اچھے شاعر کی مرثیہ نگاری کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے نوحہ کر کے اپنے جذبات کا اظہار جس طرح کیا ہے اس سے ان کے انشاء پردازانہ رنگ کا بھی اندازہ ہوگا۔

"۱۰ر محرم الحرام ۶۱ھ مطابق ستمبر ۶۸۰ء میں خانوادۂ نبوی کا آفتاب ہدایت ہمیشہ کے لیے روپوش ہوگیا، اس شقاوت اور سنگدلی پر زمین کانپ اٹھی، عرش الٰہی تھرا گیا، ہوا خاموش ہوگئی، پانی کی روانی رک گئی، آسمان خون رو دیا، زمین سے خون کے چشمے پھوٹے، شجر و حجر سے نالہ و شیون کی صدائیں بلند ہوئیں، جن و انس نے سینہ کوبی کی، ملائکہ آسمانی میں صف ماتم بچھی کہ آج ریاض نبویؐ کا گل سر سبد مرجھا گیا، علیؓ کا چمن اجڑ گیا اور فاطمہؓ کا گھر بے چراغ ہوگیا۔" (ص ۲۲۲)

اس ایجاز پر اطناب قربان کیا جاسکتا ہے۔

عام طور سے اس سانحہ پر یزید ہی پر لعنت بھیجی جاتی ہے، اس میں شک نہیں کہ یزید ہی کی حمایت میں کربلا کا واقعہ پیش آیا، مگر شاید یزید کو اس سنگینی کی امید نہ تھی، شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ جب یہ خبریں قیس یزید کے دربار میں آکر سنانے اور حضرت حسینؓ کی شہادت کی تفصیل مزے لے لے کر بیان کرنے لگا تو یزید آبدیدہ ہوگیا، اور بولا: اگر تم لوگ حسینؓ کو قتل نہ کرتے تو میں تم سے زیادہ خوش ہوتا، ابن سمیہ (ابن زیاد) پر خدا کی لعنت ہو، اگر میں ہوتا تو خدا کی قسم حسینؓ کو معاف کر دیتا، اللہ حسینؓ پر اپنی رحمت نازل کرے، زہیر نے

انعام و اکرام کی طمع میں بڑی لفاظی کے ساتھ شہادت کا واقعہ بیان کیا تھا، مگر یزید نے اسے کچھ بھی نہ دیا۔ (ص ۲۲۴)

"جب محصر بن ثعلبہ اہل بیت کا ستم رسیدہ قافلہ لے کر یزید کے پھاٹک پر پہونچا تو چلایا کہ میں ابن ثعلبہ امیر المومنین کی خدمت میں لئیموں اور فاجروں کا سر لایا ہوں، یزید نے یہ سن کر کہا کہ ام ثعلبہ نے جو بچہ جنا ہے وہ سب سے زیادہ شریر اور لئیم ہے۔ اس کے بعد حضرت حسینؓ کے سر مبارک پر ایک نگاہ ڈالی اور ایک شعر پڑھ کر کہا: خدا کی قسم حسین! اگر میں تمھارے ساتھ ہوتا تو تم کو ہرگز قتل نہ کرتا، اس کے بعد یحییٰ بن حکم نے ایک قطعہ پڑھا جس میں ابن سمیہ کی تعریف اور اہل بیت پر کچھ طعن تھا، یزید نے سن کر اس کے سینے پر ہاتھ مارا اور ڈانٹ کر خاموش کر دیا۔" (ص ۲۲۸)

"یزید نے اہل بیت کے قافلہ کو اپنے سامنے طلب کیا..... عورتوں اور بچوں کو بلا کر اپنے پاس بٹھایا، اس وقت یہ سب نہایت ابتر حالت میں تھے، یزید نے انھیں اس حالت میں دیکھ کر کہا: خدا ابن مرجانہ کا برا کرے، اگر اس کے اور تمھارے درمیان قرابت ہوتی تو تمھارے ساتھ یہ سلوک نہ کرتا، اور نہ اس طرح سے تم کو بھیجتا، فاطمہؓ بنت علیؓ کا بیان ہے کہ جب ہم لوگ یزید کے سامنے پیش کیے گئے تو ہماری حالت دیکھ کر اس پر رقت طاری ہوگئی اور بڑی نرمی اور ملاطفت کا برتاؤ کیا۔ (۲۲۹)

"یزید نے اہل بیت کو خاص حرم سرا میں ٹھہرانے کا حکم دیا، یزید خود حضرت حسینؓ کا رشتہ دار تھا، اس کی عورتیں بھی عزیز تھیں، اس ستم رسیدہ قافلہ کے زنانخانے میں داخل ہوتے ہی یزید کے گھر میں کہرام مچ گیا، ساری عورتوں نے نوحہ کیا، تین دن تک یزید کے گھر میں ماتم بپا رہا، اس دوران میں یزید برابر زین العابدین کو اپنے ساتھ دستر خوان پر بٹھا کر کھلاتا تھا۔" (ص ۲۳۰)

"شامی دشمنوں نے اہل بیت کا کل ساز و سامان لوٹ لیا، یزید نے اس کی فوری تلافی کی، تمام عورتوں سے پوچھ پوچھ کر جن کا جس قدر مال و متاع گیا تھا اس کا دونا مال دلوایا، سکینہ بنت حسینؓ اس تلافی مافات سے بہت متاثر ہوئیں، کہتی تھیں کہ میں نے منکرین خدا میں یزید سے بہتر کسی کو نہیں پایا۔" (ص ۲۳۰)

"یزید نے اہل بیت کو عزت و احترام کے ساتھ مدینہ بھجوایا اور رخصت کرتے وقت زین العابدین سے کہا: ابن مرجانہ پر خدا کی لعنت ہو، اگر میں ہوتا تو حسینؓ جو کچھ کہتے مان لیتا، ان کی جان بچانے کی پوری کوشش کرتا، خواہ اس میں میری اولاد ہی کیوں نہ کام آجاتی، لیکن اب قضائے الٰہی پوری ہو چکی، بہرحال جب بھی تم کو کسی قسم کی ضرورت پیش آئے تو فوراً مجھے لکھنا" (ص ۲۲۱)

بعض تاریخی واقعات ایسے ہیں جو عقیدتمندانہ جذبات میں لکھے گئے ہیں، مگر جب ان کا ناقدانہ تجزیہ کیا جاتا ہے تو کچھ اور ہی نظر آتے ہیں، شاہ صاحب کی ان تحریروں میں عقیدتمندانہ جذبات بھی ہیں، اور ٹھوس واقعات کی تحلیل بھی، اس لیے ان میں ایک خاص رنگ و بو ہے، یہ تحریریں اب سے پچاس برس پہلے لکھی گئی تھیں، اس وقت سے اب تک ان تحریروں کے توازن اور اعتدال پر کوئی مخالفانہ بحث نہیں ہوئی، اس لیے بھی کہ ان میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ مستند حوالوں پر مبنی ہے۔

اسی کے ساتھ شاہ صاحب یزید کی ولیعہدی کے سخت ناقد ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ امیر معاویہؓ نے یزید کو اپنا ولیعہد بنا کر قیصر و کسریٰ کی تقلید کی، اکابر صحابہؓ کی موجودگی میں خلافت کے لیے یزید کا نام کسی طرح لیا نہیں جاسکتا تھا، امیر معاویہؓ نے ان کو نظر انداز کرکے اس کو اپنا ولیعہد بنایا، عہد نبوت کے بعد کی وجہ سے بڑی حد تک حریت و آزادی کا خاتمہ ہو چکا تھا، اس لیے کچھ لوگوں نے امیر معاویہؓ کے دبدبہ و شکوہ سے مرعوب ہوگئے، کچھ لوگوں کو مال و زر کی طمع آگئی اور کچھ اختلاف امت کے خطرہ سے بچنے کے لیے خاموش ہوگئے، کسی نے خوش دلی سے یزید کو ولی عہد تسلیم نہیں کیا، اور جب وہ خلیفہ ہوا تو کبھی اس نے اپنے کو اس منصب کا اہل ثابت نہیں کیا، اس نے تخت خلافت پر قدم رکھتے ہی استبداد شروع کر دیا، عمائد کے بیعت لینے کے احکام جاری کیے، ایسی صورت میں حضرت حسینؓ اس نامنصفانہ حکم کو مان لیتے اور یزید کی غیر شرعی بیعت کو قبول کرکے تاریخ اسلام میں ظلم و ناانصافی کے سامنے سپر ڈالنے کی مثال قائم کرتے، یا اس کے خلاف آواز بلند کرکے استبداد کے خلاف عملی جہاد کا سبق دیتے، ان دونوں صورتوں میں آپ نے

دوسری صورت اختیار کی، اور اس حکومت کے خلاف جو غیر شرعی طریق پر قائم ہوئی اور جس نے بہت سی اسلامی روایات کو پامال رکھا تھا، مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے حریت و آزادی کا سبق دے دیا، جس کا ثبوت خود حضرت حسینؓ اور آپ کے دعاۃ کی تقریروں سے ملتا ہے (ص ۲۳۹-۲۳۸)

ان تحریروں میں کیسی صداقت اور حقانیت ہے، جو ایک صاحبِ دل اور صاحبِ بصیرت ہی کے قلم سے نکل سکتی تھی۔

حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ

امام حسینؓ کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے حالات ہیں جو بڑے ہی جلیل القدر صحابی تھے، آپ کے والد ماجد حضرت زبیرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حواری اور عشرہ مبشرہ میں تھے، ام المومنین حضرت خدیجہ صدیقہؓ آپ کی پھوپھی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہؓ آپ کی دادی تھیں، حضرت ابوبکر صدیقؓ آپ کے نانا تھے، آپ کی والدہ حضرت اسماءؓ کو بارگاہ نبوت سے "ذات النطاقین" کا محبت آمیز لقب ملا تھا، حضرت عائشہؓ آپ کی خالہ تھیں، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں کمسن تھے، مگر حضرت عثمانؓ کے عہد میں ان کی بہادری کی دھاک جم گئی تھی، طرابلس کی تسخیر آپ ہی کی خوش تدبیری کا نتیجہ تھی، افریقہ کی فتح کے بعد ۳۰ھ میں طبرستان کی فوج کشی میں شریک ہوئے اور نمایاں حصہ لیا، حضرت عثمانؓ کے خلاف جو شورش ہوئی تو اس نازک وقت میں خلیفۂ مظلوم کی حفاظت کے لیے جو سرفروش نکلے تھے ان میں ابن زبیرؓ بھی تھے، جنگ جمل میں اپنی خالہ حضرت عائشہؓ کی حفاظت میں اس بہادری اور بے جگری سے لڑے کہ سارا بدن زخموں سے چھلنی ہو گیا، اختتام جنگ کے بعد تلواروں اور نیزوں کے چالیسؓ سے زیادہ زخم بدن پر تھے، صفین کی خانہ جنگی میں مطلق کوئی حصہ نہیں لیا، بلکہ رفع شر کے لیے امیر معاویہؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلی، لیکن جب انھوں نے یزید کو ولی عہد بنانے کا ارادہ ظاہر کیا تو ابن زبیرؓ نے اس کی پرزور مخالفت کی۔

(باقی)

مولانا حکیم سید فخر الدین خیالیؔ اور اُن کا تذکرہ

"مہر جہاں تاب"

از جناب مولوی شمس تبریز خاں صاحب رفیق مجلس تحقیقات ونشریات، ندوۃ العلماء، لکھنؤ،

تاریخ اسلام پر نظر ڈالئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مرحومہ میں اہل بیت اور خانوادۂ نبوت نے دوسری نسلوں اور خاندانوں کے مقابلے میں اسلام کی عظیم تر خدمات اور کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں، اور انکا وجود ہا جود سرمایۂ ملت کا نگہبان اور روایات حرم کا پاسباں رہا ہے؛ اور ایسا ہونا فطری اور ناگزیر بھی تھا، کیونکہ اسلام اس دودمانِ عالی کے لیے قومی روایت اور خاندانی وراثت اور اسلامی روایت سے انکا تعلق ذاتی اور جذباتی نوعیت بھی رکھتا تھا اسلام سے خصوصیت اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قربت ونسبت کے سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اپنی عترت سے خصوصی تعلق اور ان سے محبت کا حکم دیا،

عن زید بن ارقم قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	حضرت زید بن ارقم رضؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ... اور میں تم میں دو گرانقدر
وانا تارک فیکم ثقلین، اولہما	چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ان میں سے ایک
کتاب اللہ فیہ الھدی والنور	کتاب اللہ ہے، جس میں ہدایت اور روشنی ہے
فخذوا بکتاب اللہ واستمسکوا بہ	تو کتاب اللہ کو مضبوطی سے پکڑے رہو ...
..... واھل بیتی اذکرکم اللہ	اور اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں اللہ کا
فی اھل بیتی (ثلاثا) [1]	واسطہ دیتا ہوں، یہ آپ نے تین بار فرمایا۔

[1] صحیح مسلم، ۴/ ۱۸۷۳، طبع قاہرہ ۱۹۵۵ء دارمی ۲ \ ۳۱۰ طبع مدینہ منورہ ۱۹۶۶ء،

اسی طرح مسند بزار میں ہے،

مثل اھل بیتی مثل سفینۃ نوح	میرے گھر والوں کی مثال سفینۂ نوح
من رکبھا نجا ومن ترکھا غرق	جیسی ہے کہ جو اسپر سوار ہو گیا وہ تو بچ گیا
	اور جو اس سے الگ رہا وہ غرق ہوا،

امام ترمذیؒ نے حضرت زید بن ارقمؓ سے اس طرح روایت کی ہے،

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم
انی تارک فیکم ما ان تمسکتم بہ	میں وہ چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ
لن تضلوا بعدی احدھما	جب تک تم انھیں پکڑے رہوگے تو میرے
أعظم من الآخر، کتاب اللہ	بعد گمراہ نہ ہوگے، ان میں سے ایک
حبل ممدود من السماء الی الارض	دوسری سے بڑی ہے، کتاب اللہ
وعترتی اھل بیتی ولن یتفرقا	آسمان سے زمین کی طرف لٹکی ہوئی
حتی یردا علی الحوض فانظروا	رسّی ہے اور دوسری چیز میرا خاندان
کیف تخلفونی فیھما [2]	اور میرے گھر والے ہیں جو میدان
	حشر میں اسوقت تک الگ نہیں ہونگے
	جب تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس
	نہ آئیں تو اس کا خیال رکھو کہ ان دونوں

سادات کرام کی عالمگیر اسلامی خدمات کا تعارف تو کئی مجلدات کا متقاضی ہوگا، ہم سردست یہاں حسنی سادات کی اُس شاخ سے بحث کرنا چاہتے ہیں جو امیر قطب الدین محمد الحسنی المدنیؔ

[1] مجمع الفوائد ۲ / ۲۳۶ [2] سنن ترمذی ۶۲۶، دہلی ۱۲۶۶ھ،

(۵۸۱ھ — ۶۷۷ھ) کے ساتھ ہندوستان آئی، امیر قطب الدین حضرت امام حسنؓ کی تیرہویں پشت میں ایک عالی ہمت اور اہل علم بزرگ تھے، جنھیں خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہندوستان جانے کا حکم اور فتح کی بشارت ملی، اور وہ سادات اور مجاہدین غزنی کے ساتھ دہلی تشریف لائے، اور قنوج، ہنسوہ (فتحپور) کڑا اور مانک پور کو فتح کر کے اسلامی حکومت میں شامل کیا[1]۔ ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ میں عالی نسب سادات کے ذکر میں دہلی کے شیخ الاسلام سید قطب الدین مدنیؒ کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا ہے،[2] سادات کا یہ خاندان ایک صدی تک کڑا، (الہ آباد) میں رہنے کے بعد جائس، پھر نصیرآباد اور پھر تکیہ رائے بریلی منتقل ہوا، اس خاندان میں صلاح وتقویٰ، علم وفضل اور کبھی کبھی امارت وریاست کا بھی اجتماع رہا، بہت سے افراد بدایوں اور دوسرے علاقوں کے قاضی بھی ہوئے، اسطرح یہ گھرانہ اپنی پوری تاریخ میں علم وعمل کے لیے ممتاز رہا ہے اور اس کے ہر دور میں شریعت وطریقت کے جامع افراد سامنے آتے رہے ہیں

امیر قطب الدینؒ کی چودھویں پشت میں مشہور بزرگ حضرت شاہ علم اللہؒ (۱۰۳۳ھ - ۱۰۹۶ھ) گزرے ہیں جو علم وفضل، تقویٰ اور اتباع سنت کے مقام بلند پر فائز تھے، آپ کچھ دنوں لشکرِ شاہجہانی میں رہے، پھر ریاضات ومجاہدات میں مشغول رہ کر حضرت مجدد سرہندیؒ (۹۷۱ - ۱۰۳۴ھ) کے ممتاز خلیفہ حضرت سید آدم بنوریؒ (م ۱۰۵۳ھ) سے خلافت پائی انھوں نے آپ کو اپنے عمامہ اور حضرت مجددؒ کی دستار کے ساتھ رخصت کر دیا، آپ نے ایک بزرگ کی درخواست پر تکیہ (رائے بریلی) میں طرح اقامت ڈالی اور عبادت وریاضت، اتباع سنت اور تزکیہ نفوس میں مشغول رہ کر ۶۳ سال کی عمر میں عالمگیر کے عہد میں انتقال فرمایا

مولانا سید ابو الحسن ندوی مدظلہ، حضرت شاہ غلام علیؒ کے ملفوظات "درالمعارف"

---

[1] تاریخ آئینہ اودھ بحوالہ سیرت سید احمد شہید ۱/۹، [2] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۱۱ (کلکتہ ۱۸۶۲ء)

اور بحرزخار کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

"انتقال کی شب کو عالمگیرؒ نے خواب دیکھا کہ آج کی رات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی، بادشاہ کو اس خواب سے بہت تشویش ہوئی، علماء سے تعبیر دریافت کی تو انھوں نے کہا" اس رات سید علم اللہ صاحب کی وفات ہوئی ہوگی کہ وہ اتباع سنت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بہ قدم تھے، سرکاری وقائع نگار کی اطلاع سے معلوم ہوا کہ اسی شب کو جناب ممدوح نے انتقال کیا"[1]

سید آدم بنوریؒ کے خلیفہ خواجہ محمد امین بدخشی نے نتائج الحرمین میں تفصیل سے آپ کے حالات لکھے ہیں[2]۔

شاہ علم اللہؒ کے برادر عمزاد دیوان خواجہ احمد (م ۱۰۸۸ھ) مشہور عالم اور صوفی باصفا اور مشہور زمانہ عالم شیخ محب اللہ الہ آبادی کے تلمیذ تھے، شروع میں ان پر علوم ظاہری کا غلبہ تھا اسلیے علم باطن اور تصوف سے بعد تھا، شاہ علم اللہؒ چاہتے تھے کہ انکی طرح وہ بھی حضرت آدم بنوریؒ سے مرید ہو جائیں مگر وہ تیار نہیں ہوتے تھے، اور یہ فرماتے تھے کہ ہم لوگ دانشمندوں اور علماء کے طبقے میں ہیں، اس لیے جو شیخ علوم ظاہری پر نظر نہیں رکھتا اس کے قائل نہیں ہوتے، شاہ صاحب نے جواب دیا کہ وہ اگرچہ علوم ظاہری میں ممتاز نہیں، لیکن اللہ تعالےٰ نے انھیں ایسے علم لدنی سے نوازا ہے جس کے مقابل یہ علوم ظاہری ہیچ ہیں، انھوں نے علوم باطنی کے کچھ نمونے بھی ان کے سامنے رکھے جس کے بعد وہ حضرت آدم بنوریؒ کی خدمت میں جانے پر راضی ہو گئے، حضرت بنوریؒ ان دنوں شاہجہان کی ناراضگی کے سبب عازم حجاز تھے، اور گوالیار میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ

---

[1] سیرت سید احمد شہیدؒ ۱/۸۶، [2] حضرت کے خاندان کے ایک عالم واہل قلم مولانا محمد الحسنی مرحوم کا لکھا ہوا تذکرہ شاہ علم اللہؒ بھی شایع ہو چکا ہے نیز بحرزخار وجیہ الدین لکھنوی اور نزہتہ الخواطر، جلد پنجم میں آپ کے حالات مذکور ہیں،

یہ حضرات ان کی خدمت میں پہنچے اور خواجہ احمد نے بیعت کی۔[1]

آپ کے چاروں صاحبزادگان مولانا سید آیت اللہ، مولانا سید محمد ہدیٰ، مولانا سید ابو حنیفہ اور مولانا سید محمد (صاحب شرح کلمات نقشبندیہ) علم و تقویٰ کی جامعیت اور اتباع سنت کے لیے امتیاز رکھتے تھے اور اپنے والد ماجد کے نقش قدم پر تھے۔[2] اسی طرح انکی اولاد میں بھی انکے خلف الصدق اور جانشین پیدا ہوتے رہے، جنھوں نے علم و دین کے اجتماع کی خاندانی روایت برقرار رکھی،

شاہ علم اللہؒ کے پوتے مولانا سید محمد عدل (م ۱۱۹۲ھ) پر مولانا حکیم سید عبد الحیؒ کے الفاظ میں اودھ کی مشیخت ختم تھی، ان سے کاکوری کے صوفیہ اور فرنگی محل کے علما مستفید ہوئے،[3] شاہ صاحب کے پرپوتے شاہ ابو سعید حسنی (م ۱۱۹۳ھ) حضرت شاہ ولی اللہ سے خصوصی طور پر مستفید ہوئے تھے اور انھیں شاہ محمد عاشق پھلتی سے تکمیل سلوک کے بعد اجازت حاصل ہوئی تھی، اور آپ کو مجاہد فی سبیل اللہ اور شہید راہ خدا حضرت سید احمد رائے بریلویؒ کا جد مادری ہونے کا شرف حاصل ہے، ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک کے داعی و علمبردار حضرت سید احمد شہیدؒ (۱۲۰۱ — ۱۲۴۶ھ) حضرت شاہ علم اللہؒ کی پشت میں تیسری میں ہوئے ہیں، جنھوں نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی پیدا کردہ ذہنی و ثقافتی بیداری کو ایک اسلامی دعوت و عزیمت کی پرجوش تحریک میں بدل دیا جس کے دور رس اصلاحی اثرات سے برصغیر ہند و پاک ابتک متاثر ہیں، اور نامعلوم زمانے تک متاثر رہیں گے؛ حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد، انگریزوں کے خلاف پہلی جنگ آزادی بھی تھی جسے انگریزوں نے وہابیت کے نام سے ...... بدنام کیا، شاہ علم اللہ کے پرپوتے مولانا سید محمد نعمان، سید احمد شہیدؒ کے والد ماجد سید محمد عرفان کے بھائی اور برگزیدہ عالم و درویش تھے، انھیں شاہ ولی اللہؒ سے تلمذ تھا، حج و زیارت کے بعد بیت المقدس کی زیارت کو گئے تھے، کہ وہیں انتقال فرمایا (۱۱۰۹ھ)

آپ نے خاندان کے بزرگوں کا تذکرہ "اعلام الہدیٰ" کے نام سے لکھا تھا،[4] اس خانوادے کے اہل علم

---

[1] اعلام الہدیٰ (قلمی)، ص ۱۰۸ [2] تذکرہ شاہ علم اللہ ص ۱۸۴-۱۸۰ (۱۹۷۰ء) [3] نزہۃ الخواطر ۶/۳۳۱

[4] نزہۃ الخواطر ۶/۳۸۸

و اہل دل بزرگوں میں مولانا قطب الہدیٰ بن مولانا سید واضح شاہ عبد العزیزؒ کے تلمیذ اور شاہ غلام علیؒ دہلوی کے مرید تھے آپ نے ۱۲۲۶ھ میں وفات پائی، متاخرین علما و مشائخ میں مولانا محمد علی ٹونکی حضرت سید صاحبؒ کے بھانجے اور خلیفہ تھے، فارسی میں جلاء العیون فی سیر النبی الامین المامون، لکھی، اور مخزن احمدی میں حضرت سید صاحبؒ کی تحریک کا تاریخی احاطہ کیا، ۱۲۶۶ھ میں انتقال کیا۔[1]

حضرت احمد شہیدؒ کے خلیفہ مولانا سید محمد ظاہر (۱۱۹۸ — ۱۲۷۰ھ) بڑے خوش تقریر اور صاحب کمالات بزرگ تھے، علوم دین کے ساتھ اردو، ہندی اور فارسی میں شاعری بھی کرتے تھے، اور ہندی کے صاحب دیوان شاعر تھے، تحریم الحرام، قاطع البدعۃ، خیر المسالک اور وحدۃ الوجود کے نام سے چند رسالے بھی سپرد قلم فرمائے،[2] یوپی کے مشرقی اضلاع میں آپ کے سیکڑوں مرید تھے اور آپ کے پُراثر مواعظ سے لوگ بدعت سے متنفر اور سنت نبوی کے دلدادہ ہو جاتے تھے؛ آپ کے مزید حالات اور نمونہ کلام ناظرین آگے ملاحظہ کریں گے،

اس خاندان کے آخری ممتاز بزرگوں میں خواجہ احمد حسنی نصیر آبادیؒ (۱۲۲۱ — ۱۲۸۹ھ) کا نام آتا ہے، جو مولانا سخاوت علی جونپوری کے تلمیذ رشید تھے، مولانا فخر الدین خیالی کے بقول انھوں نے مجددین دیں جیسے کارنامے انجام دیے اور ان کے ہاتھوں پہ ہزاروں لوگوں نے بدعات و سیئات سے توبہ کی"[3]

مولانا خیالی نے ان کا تفصیلی تذکرہ "مہر جہاں تاب" میں حالؔ، قالؔ و سالؔ کے ابواب کے تحت صفحہ ۷۰ سے صفحہ ۲۷۹ تک کیا ہے؛[illegible]

---

[1] نزہۃ الخواطر ۷/۴۵۳ [2] نزہۃ الخواطر ۷/۲۴۵-۲۴۶ [3] اعلام الہدیٰ ص ۱۱، (شعبۂ مخطوطات ندوۃ العلماء) [illegible] مفصل حالات کے لئے ملاحظہ مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی کی کتاب کاروان ایمان و عزیمت ص ۱۳۲-۱۰۰ لاہور، جو پہلے الفرقان لکھنؤ میں بالاقساط چھپی تھی، [illegible]

اس دور کے بزرگوں میں مولانا سید عبدالسلام ہنسویؒ (۱۲۳۲ - ۱۲۹۹ھ) بہت قوی النسبت اور صاحبِ تاثیر عالم و صوفی تھے، دہلی میں شاہ عبدالغنی مجددیؒ سے حدیث کا درس لیا اور ان کے برادرِ بزرگ حضرت شاہ احمد سعید صاحبؒ سے منازلِ سلوک طے کیے اور اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے۔[1]

ان ہی بزرگوں میں سید شاہ ضیاء النبیؒ (۱۲۴۶ - ۱۳۲۶ھ) بہت بابرکت بزرگ گزرے ہیں، خواجہ احمد حسنیؒ کے خلیفہ تھے، ان کے بارے میں مولانا فخر الدین صاحب سیرۃ السادات میں لکھتے ہیں، آج کل حضرت خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور اسلاف کرام کی پیروی میں پورے خاندان میں ان کی نظیر نہیں۔[2]

مولانا عبدالحئی صاحب لکھتے ہیں، کہ وہ دنیا کی برکت، خلقت انسانی کے مقصد کامل (وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون) کی سچی تصویر و عملی تفسیر اور معرفت کے لب لباب تھے، ان کا وجود اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، الخ[3]

بزرگوں کے اسی خاندان سے مولانا حکیم سید فخر الدین صاحب خیالی بھی تعلق رکھتے ہیں، جن کا تذکرہ بیان کیا جا رہا ہے۔

مولانا سید عبدالعلی صاحب

حکیم صاحب کے والد ماجد مولانا سید عبدالعلی صاحب بھی خاندانی روایات کے حامل بزرگ تھے، اور روحانیت سے آپ کو حصۂ وافر ملا تھا، آپ کے نامور پوتے مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحب فرماتے ہیں، "مولانا میر عبدالعلی ایک درویش سیرت فاضل بزرگ تھے اور باوجود تحصیلدار ہونے کے فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، آپ کا سید احمد شہیدؒ کے مجاز تھے، خشیت الٰہی کا یہ حال تھا کہ جب سرکاری ڈاک آپ کے ہاتھ میں دی جاتی تھی تو

[1] حیات عبدالحئی از مولانا ابوالحسن صاحب ندوی ص ۳۹، ۴۰ [2] ایضاً ص ۴۳ [3] ایضاً ص ۴۱

روز قیامت میں حساب و کتاب کا پرچہ یاد کر کے رو پڑتے تھے۔[1]

ان کے فرزند مولانا فخر الدین صاحب لکھتے ہیں، اپنے دور کے بہت بڑے زاہد و متقی انسان تھے، تعلقات دنیاوی اور سلسلۂ ملازمت کے باوجود با ہمہ و بے ہمہ، دل بیار دست بکار کا نمونہ تھے، ..... بکمال فیاضی و سخاوت تمام مشاہرہ مستحقین و مسافرین پر صرف کر دیتے، اپنے لیے ایک یا دو سادہ جوڑے سے زیادہ کچھ پسند نہ فرماتے ..... طبیعت میں سادگی اور انکساری اس درجہ تھا کہ کبھی فرش نفیس اور بستر نرم کے پابند نہ ہوئے، کبھی تخت پر کبھی کرسی پر اور کبھی زمین پر پیر پھیلا لیتے اور تھوڑی دیر سو لیتے ... شعر گوئی سے بھی ذوق تھا، اور عربی و ریختہ میں اشعار کہتے تھے، عربی میں علیؔ اور ریختہ میں ہجرؔ تخلص کرتے تھے، حاصل یہ کہ یہ تمام آگہی اتباع احکام شرعی اور فقر و زہد میں زندگی گزار دی اور دمِ واپسیں تک اسی حالت پر قائم رہے، وفات سے پہلے آخری کلام جو زبان سے ادا ہوا وہ "ھو الرفیق الاعلیٰ" تھا جو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر ارتحال کے وقت جاری تھا، انتقال مرض فالج میں ہوا۔ سنہ ۱۲۶۹ھ سنہ ۱۸۵۳ء میں ناگود (مدھیہ پردیش) میں انتقال فرمایا، اور شہر کے قریب مسجد عبدالسبحان میں (جو قلعہ کے نیچے واقع ہے اور اس کفرستان میں پہلی مسجد ہے جو خود انکی سعی سے تعمیر ہوئی) مدفون ہوئے۔[2]

مولانا حکیم سید فخر الدین خیالیؒ

علم و ادب کی دنیا میں یہ اندھیر اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ اس میں حفظ مراتب اور حق شناسی و حق گوئی کے بجائے تعصب و طرفداری اور تجاہل و حق تلفی کے ذریعہ علم و فضل کی حامل شخصیتوں کے ساتھ بے انصافی اور ستم ظریفی کا برتاؤ کیا جاتا رہا ہے، اور جب تک کوئی ادیب و اہل قلم پیشہ ور اور شہرت طلب ادیبوں کے طور طریقے نہ اپنائے وہ ناقدین و مورخینِ ادب کی توجہ سے محروم ہی رہتا ہے، اگر اردو ادب ہی کو سامنے رکھیے تو

[1] مقدمہ یاد ایام ص ۵ [2] حیات عبدالحئی ص ۱۰۹ بحوالہ مہر جہانتاب و اعلام الہدیٰ ۹-۱۰۸

اس عام رویے کا پتہ چل سکتا ہے کہ اردو کی تاریخ میں جن مشاہیر کا ذکر کیا جاتا ہے ان کے کتنے معاصرین اپنی حقیقی قدر و قیمت اور جائز مقام سے کس طرح محروم کیے گئے ہیں!

ان ہی مظلومین میں مولانا فخرالدین خیالی کی ذات گرامی بھی ہے، جو عربی کے عالم، فارسی کے انشا پرداز اور اردو کے بہت اچھے شاعر تھے اور انھوں نے مشاہیر اسلام کے ساتھ عربی، اردو اور فارسی کے باکمالوں کا جامع تذکرہ "مہرجہاں تاب" لکھا اور اردو کا ضخیم دیوان یادگار چھوڑا، اُن کے معاصرین میں غالباً صرف لالہ سری رام کو توفیق ہوئی کہ انھوں نے اپنے مشہور تذکرہ "خمخانۂ جاوید" میں مولانا مرحوم کے حالات اور اشعار کا نمونہ درج کیا، اس میں کچھ دخل ان کی عزلت پسندی اور طبیعت کی بے نیازی کو بھی تھا، جس کے بارے میں ان کے صاحبزادے مولانا حکیم عبدالحیؒ صاحب لکھتے ہیں۔

"طبیعت میں کم آمیزی کا مادہ تھا اور اظہار کمال سے سخت نفرت تھی، یہی وجہ تھی کہ زندگی میں ان کو کم کسی نے جانا اور بایں ہمہ کمالات علمی و عملی وہ گوشۂ گمنامی میں چھپے رہے"[1]

انکی ولادت تکیہ شاہ علم اللہ (رائے بریلی) میں ذیقعدہ ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) میں ہوئی، ان کا سلسلۂ نسب آٹھویں پشت میں قاضی محمد معظم بن قاضی احمد نصیرآبادی سے ملتا ہے، جو شاہ علم اللہؒ کے اجداد میں تھے، ابتدائی تعلیم مولوی علی بخش جائسی، مولانا محمد طٰہٰ نصیرآبادی اور مولانا سید محمد ظاہرؒ اور حکیم احمد جان دہلوی سے حاصل کی، ۱۲۷۳ھ میں لکھنؤ آکر مولانا محمد نعیم فرنگی محلیؒ کے درس میں شریک ہوئے اور شرح وقایہ، مشکوٰۃ شریف اور جلالین پڑھی، اپنے مطالعہ کی سرگذشت انھوں نے اس طرح سنائی ہے، "احیاء و کیمیائے سعادت، جواہر القرآن، عوارف، منبہات ابن حجر، قول جمیل اور شاہ ولی اللہؒ کے دیگر رسائل تصوف، کنز و ہدایہ و درمختار

[1] گل رعنا ص ۵۳

اور ردمحتار، فتاویٰ قاضی خاں اور سراجیہ بالاستیعاب اور متداول تفسیر و حدیث کے بیشتر حصے، ادب میں مقامات، نفحۃ الیمن، انشا میں عجب العجاب، قصص میں الف لیلہ، شعر میں سبعہ معلقہ مع شرح مکمل، ادب و تاریخ میں واقدی، حیاۃ الحیوان، کشف الظنون، تہذیب التہذیب اور علوم متعارفہ کی کتابیں تدبر و اتقان کے ساتھ مطالعہ کیں اور واہب مطلق کی عنایت سے عربی کی غامض عبارتوں پر عبور حاصل کر لیا، اور مذاق سخن کے تحت شاعری کی مشق بھی کی"۔[1]

طب حکیم محمد یعقوب لکھنوی سے پڑھی، اردو شاعری میں شیخ امیر اللہ تسلیم (م ۱۳۲۹ھ) سے استفادہ کیا، ضلع بیدر میں سید محمود اصفہانی حریفؔ سے فارسی زبان و محاورہ کی تصحیح اور مشورۂ سخن کیا، راجپوتانہ اور ساگر میں مہتمم بندوبست کے اجلاس میں نائب سررشتہ داری کے عہدے پر سال ڈیڑھ سال رہے، پھر کچھ دنوں وطن رہ کر حیدرآباد کے مختلف اضلاع کے سرکاری اسکولوں میں تقریباً آٹھ سال رہے جس کی تفصیلات انھوں نے اپنے حالات میں بیان کی ہیں، کچھ عرصے بھوپال میں عدالت فوجداری میں اظہار نویسی کے عہدے پر رہے، پھر وطن واپس آکر ٹونک تشریف لے گئے، جہاں نواب ابراہیم علی خان نے صیغۂ طبابت سے تنخواہ مقرر کر دی تھی، ڈیڑھ سال رہنے کے بعد پھر وطن چلے آئے اور ایسے آئے کہ پھر کہیں نہیں گئے، وطن کے گوشۂ عزلت میں زندگی پوری کر دی۔[2]

احسان و سلوک کے منازل خواجہ احمد حسنیؒ سے طے کیے تھے، اور مولانا سید محمد ظاہرؒ سے خلافت پائی تھی، مگر کسر نفسی کے سبب پیری مریدی نہیں اپنائی، مولانا حکیم عبدالحیؒ صاحب نے آپ کے رنگ طبیعت، سادگی فطرت اور حسن سیرت کا بڑا دلنشیں نقشہ پیش کیا ہے وہ فرماتے ہیں،

[1] مہرجہاں تاب، ص ۹۹، [2] گل رعنا ص ۵۲۵

" مزاج میں خاموشی، متانت، حلم اور عزلت پسندی انتہا درجہ کی تھی، برادرانہ جھگڑوں سے ان کو کچھ واسطہ نہیں تھا، ہر شخص سے دوست ہو یا دشمن اچھی طرح سے ملتے، اور کسی سے پرخاش نہ رکھتے، صبر و قناعت کی صفت انکی ہر ادا سے ظاہر ہوتی تھی، تمکنت اور غرور انکو چھو نہیں گیا تھا، ایک چار یا کوئی رات کے وقت آتا تو گھر سے باہر نکل کر اس کا حال پوچھتے اگر وہ کسی مریض کو دکھانے کو لے جانا چاہتا تو اسی وقت اسکے ساتھ ہو لیتے اور بڑی شفقت سے اسکو دیکھتے اور دوا بتاتے تھے، ایک زمانہ میں طاعون شدت سے پھیلا ہوا تھا، گاؤں کے گاؤں ویران پڑے ہوئے تھے، مرد عورت لڑکے بوڑھے سب جھونپڑیوں میں پڑے ہوئے تھے، ان جھونپڑیوں میں خود جاکر بیمار پرسی کرتے اور دوا بتاتے تھے الخ[1]

مولانا عبدالحئی صاحب نے نزہتہ الخواطر میں بھی آپ کا جامع تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

" آپ ظاہر و باطن دونوں لحاظ سے قابل تعریف تھے، پاک طینت، قناعت پسند، بے تکلف، گوشہ نشین، اصلاح نفس کے لیے فکرمند، حوادث زمانہ کی کثرت کے باوجود اُن پر صابر و شاکر، دینی امور کا خیال رکھنے والے اور عبادات کے پابند تھے، بات چیت اور پہننے اوڑھنے میں تکلف پسند نہیں کرتے تھے، کسی لباس اور کسی ہیئت میں لوگوں سے ملنے میں عار نہیں محسوس کرتے تھے، آپ کا سینہ آئینہ تھا، جو گرد کدورت سے صاف تھا، آپ کبھی کسی کی برائی نہیں کرتے تھے، وفات سے قریب پانچ سال پیشتر امور دنیا سے ہاتھ جھاڑ چکے تھے، اور عبادت جمعہ و جماعت قرآن کی تلاوت اور کتابوں کے مطالعہ و تصنیف اور تدریس میں مشغول رہتے تھے،[2]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے شاہد عینی | حضرت خیالی نے اپنے تذکرہ مہر جہانتاب میں سنہ وار

---

[1] گل رعنا ص ۵۲۶ [2] نزہتہ الخواطر ۸/۳۵۴-۳۵۸

اپنے حالات و اسفار کے تاثرات بھی لکھے ہیں، جن کا کچھ انتخاب یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ ان کی زندگی کا اہم واقعہ جس کے وہ عینی شاہد ہیں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی ہے، جس کا ذکر انھوں نے تذکرہ میں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

" ہم لوگ مولانا محمد ظاہر صاحب کے ساتھ ان کے حلقہ مریدان میں بنارس، غازی پور، اعظم گڈھ اور جونپور کے سفر میں تھے، ایک شام جگدیش پور کے زمیندار (غالباً اس سے مراد راجہ کنور سنگھ ہیں، جو اپنے جذبہ بغاوت کے لیے بہت مشہور ہوئے) کے پاس بیٹھے تھے کہ غدر ۱۸۵۷ء کی خبر پہنچی، راجہ نے کہا کہ اب خطرہ پیدا ہو گیا ہے، اس لیے ہم لوگ وہاں سے روانہ ہوگئے اور مسافر خانہ نامی گاؤں میں ٹھہرے، اسی دوران ایک دشمنی سوار یہ شاہی فرمان لیکر آیا کہ ملک انگریزوں کے ہاتھ میں چلا گیا ہے اور ہم کلکتہ جا رہے ہیں اس خبر سے سپاہیوں میں تنخواہ کے لیے شور و شغب ہوا، مرزا آغائی چکلہ دار فوج کے سربراہ تھے، اس لیے ان کے خلاف ہنگامہ ہونے لگا، انگریز جنرل بار کو سنا سے ہاتھی پر بیٹھا کر باہر لیجانا چاہا تنخواہ داروں نے پیچھا کیا تو مسٹر بار کو نے توپ سر کر کے انھیں منتشر کر دیا۔

ہم لوگ جونپور آکر مولوی امام بخش صاحب کے مہمان ہوئے جنکے اساتذہ میں مولانا عبدالحلیم لکھنوی تھے، اور ان کے درس میں فارغ التحصیل علما رہتے تھے، ان کے تلامذہ میں مولانا سخاوت علی اور مولانا کرامت علی بھی تھے، وہاں سے اعظم گڈھ گئے، جہاں لوگ قصیدہ شاہ نعمت اللہ کرمانی کے بموجب نئے انقلاب کی پیش گوئی کر رہے تھے،

از پیشتر ک ہر شد تی رہ بسخنہا   دا گویا کنا نند نقارہ فوازند

مبارکپور میں مولانا سید محمد ظاہر وعظ فرمانے سے پہلے مجھ سے تلاوت قرآن کراتے اور پھر

تشریح فرماتے تھے، بیشمار لوگوں نے ان سے بیعت کی اور گناہوں سے توبہ کی۔ اسی دوران
مولانا کرامت علیؒ، مولوی فیض اللہ موئیؒ، شاہ محمد فصیحؒ، مولوی غلام رسولؒ (ایڈیٹر زبل
رسڑا)، مولوی طاہر، مولوی محمد حسین فرزند مولوی سخاوت علیؒ سے ملاقات ہوئی، پھر
نازی پور گئے اور مولوی غیاث الدین تحصیلدار کے یہاں دس دن ٹھہرے جو سید صاحبؒ
کے عقیدت مند تھے، پھر بھتری صید پور میں شیخ فرزند علی مرحوم کے فرزندوں کے ہاں
تین ماہ ٹھہر کر بنارس گئے۔

۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ء میں میری عمر اٹھارہ سال تھی جب میرٹھ سے یہ شورش شروع
ہوئی، میں نصیر آباد میں تھا، جہاں قیدیوں نے خود کو آزاد کرا لیا، ہم لوگ گھر میں
بیٹھے رہے، اس ہنگامہ میں دوست دشمن کی تمیز نہیں رہی اور زمیندار آپس میں لڑ پڑے
بارہ سال کے بچے اور نوّے سال بوڑھے بھی میدان میں تھے، ان دنوں ناگود (مدھیہ
پردیش) کے تھانہ داروں نے کلکٹر کو لکھا تھا کہ خفیہ کلچوں کی پہلی روانگی کا راز نہیں
معلوم ہو رہا ہے، تفتیش کے باوجود کلکٹر کو بھی نہیں معلوم ہو سکا، یہ خفیہ کلچے گویا سازشی
خط تھے، جن کے روانہ ہونے کے ایک ماہ کے اندر ہی یہ ہنگامہ کھڑا ہو گیا، لکھنؤ میں برجیس قدر
خلف معشوق محل تخت پر بٹھائے گئے اور انکی ماں نے (جنھوں نے اودھ کا نام روشن کیا)
ہتھیار سنبھالے، شرف الدولہ کشمیری وزیر بنائے گئے، اور ممو خان مقرب ہوئے، بینی مادھو
اور مان سنگھ فوج کے افسران مقرر ہوئے، توپوں کی گھن گرج سے کان بہرے ہو رہے
تھے، اور آرام بے آرامی میں بدل گیا تھا (صدائے توپ گوش ہا کر ساخت، آرامش بے
آرامی در ساخت) بیلی گارد اور عالم باغ گولوں کی بارش سے میدان ہو گئے اور لوگوں کے
سینے دیپہلو زخمی، عزتیں برباد، اور گھر غیر آباد ہو گئے۔ (بیلی گارد و عالم باغ از گزند

گلولہا داغ شد و سینہ و پہلو پُر جراحت و داغ، ناموسہا برباد و خانہ ویرانی آباد (ص ۲)"
نو ماہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا، میجر گال چند سواروں کے ساتھ فیض آباد یا لکھنؤ سے کشتی کے
ذریعہ الٰہ آباد چھاؤنی جا رہا تھا کہ کاروانسرائے رائے بریلی میں ایک ہجوم نے بندوقوں
سے حملہ کر دیا، اس نے طپنچہ سے فیر کیے پھر خودکشی کر لی، شمس الدین خاں نامی شخص نے
لاش کو تلوار سے زخمی کیا اور حرمت خان نے یہ کہہ کر اس کا خون چکھا کہ میں نے نذر مانی
تھی کہ بغیر انگریز کا خون پیے میں انگوٹھی نہیں پہنوں گا۔

بڑے نانا دیوان اور چھوٹے مولوی سعید الدین مظفر پور میں ہنگامہ سے الگ تھے، مگر شاہ نوازی
اور انگریز دشمنی کے الزام سے بچنے کے لیے چودھیاں نامی دیہات چلے گئے جو رائے بریلی سے
چار کوس تھا، میں ماموں شاہ ضیاء النبی، محمد حسین خان اور عورتوں بچوں کے ساتھ
وہاں چار روز مقیم رہا، پھر ہم سب افواہوں کے سبب نصیر آباد میں ایک ماہ تک رہے
اس کے بعد رائے بریلی میں انگریزی فوج آگئی اور شمس الدین خاں کو قتل اور میر بادی
نامی رئیس کو ڈکیتی کے الزام میں پھانسی دی گئی، حرمت خاں نے ابراہیم شرقی کے
بنائے ہوئے ایک قلعہ میں پناہ لی تو اسے انگریزوں نے مسمار کر دیا، بھاگے ہوئے لوگوں
کو شہر واپس ہونے کا حکم ہوا اور ہم لوگ بھی گھر آگئے۔ (ص ۱۰۰-۲۷۷)

ذاتی سرگذشت اور جنوبی ہند کے سفر

۱۲۸۲ھ میں اگرہ کے سفر میں مولانا نواب قطب الدین خان تلمیذ مولانا
شاہ محمد اسحاق صاحب دہلویؒ سے ملاقات ہوئی، وہاں نواب وزیر الدولہ
والیٔ ٹونک کی خیموں سے بنائی ہوئی مسجد میں (جس میں ۳، ۴ سو آدمی آتے تھے) مولانا کے
پیچھے عصر کی نماز پڑھی اور انھوں نے میرے التماس پر سورۂ مزمل اور یا ودود کی اجازت عطا فرمائی

(صفحہ ۲۸۲)

لکھنؤ میں ایام تحصیل علم کے بارے میں لکھتے ہیں "مسجد دبیر الدولہ (نزد گول دروازہ) میں مقیم رہ کر مولانا محمد نعیم فرنگی محلیؒ کے درس میں شریک ہوتے، وہیں طب کی بھی تحصیل کی اور ہفتے میں ایک بار شیخ امیر اللہ تسلیم کے پاس جاکر اصلاحِ سخن لیتے اور پندرہ واڑے میں ان کے ساتھ نواب مرزا محمد تقی کے مشاعرے میں نصف شب تک شریک رہتے، جس میں اساتذۂ وقت میں منشی فدا علی عیش میر کے فرزند میر کلو عرش، میر خطا شاگرد ناسخ، میر اثر فعلی شاگرد نسیم، میاں عصمت ریختی گو، مرزا مچھو بیگ عاشق اور دوسرے شعراء آتے تھے۔" (صفحہ ۸۶)

وہ ۱۲۹۰ھ میں حیدر آباد پہنچے جہاں آٹھ سال تک رہے، اس عرصے میں جن شہروں میں انھیں رہنے کا اتفاق ہوا انکی تاریخ اور عمارتوں کا تعارف کرایا ہے، سلطنت آصفیہ کے انتظامیہ اور امراء کے تعارف کے ساتھ حیدر آباد کی تمدنی اور ثقافتی زندگی پر بہت اچھی روشنی ڈالی ہے (ص ۶۹۹-۸۳۰) وہاں سے وطن آکر ایک عزیز کے ساتھ بھوپال گئے، اور نواب صدیق حسن خان کے صاحبزادوں کی تقریب نکاح میں شرکت کی اور وہاں چند سال مقیم رہے، حیدر آباد کی طرح وہ اس اسلامی ریاست کی بھی بہت تعریف کرتے اور وہاں کے نظم و نسق اور عمارتوں کا تعارف کراتے ہیں۔

نواب صدیق حسن خان کی سادہ زندگی، . . . . رعایا پروری اور دینی خدمات کی دل کھول کر تعریف کرنے کے بعد ان کے مدار المہام مولوی جمال الدین خان (م ۱۲۹۹ھ) کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "وہ عام مسلمانوں کے ساتھ برادرانہ برتاؤ کرتے تھے اور پیرانہ سالی کے باوجود جمعہ و جماعت کی پابندی کرتے، ہر جمعہ کو وعظ کہتے اور ترجمۂ قرآن کا درس دیتے انھیں کی توجہ سے بھوپال میں حفاظ بھی ترجمۂ قرآن سے واقف تھے، تمام مساجد میں امام و موذن مقرر تھے، اور وہاں جاڑوں میں گرم پانی مہیا رہتا تھا، اور وہ اپنے یہاں سے چار سو طلبہ کو وظیفے دیتے تھے،

غرض یہ دونوں اقطاب میں سے تھے۔" آگے چل کر لکھتے ہیں،

الموجز این شہر بقدردانی و فیض رسانی	قصہ مختصر ایں شہر والیۂ ملک کی
والیۂ ملک دام اقبالہا و برکت قدر	قدردانی اور نواب والا جاہ کی ہنر
افروزی و ہنر پروری نواب والا جاہ	پروری کے سبب علماء و حفاظ، حکماء
مجمع علماء و حفاظ و حکماء و دبیران و	ادباء اور حکام و شعراء کا مرکز بن
ناظمان ملک و ہم اہل سخن بود ہر گرا دیدم	گیا تھا، میں نے جسے بھی دیکھا اس کے
حدیث نبوی در بغل و خبرش بر زبان	بغل میں حدیث اور زبان پر ارشاد
میگشت و قانون ریاست ہم بیشتر بر	نبوت تھا، قانون ریاست بھی زیادہ
فتوی شرعی بود [1]	تر شریعت پر مبنی تھا، (باقی)

[1] مہر جہاں تاب ۱۴۸

سال رواں کے تین بین الاقوامی سیمیناروں
کے
سفر کی سرگذشت

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

ادھر گذشتہ چار مہینوں میں تین اہم بین الاقوامی سیمیناروں میں شرکت کرنے کا موقع ملا، پہلا سیمینار تو جنوری کے آخری ہفتہ میں دہلی میں ہوا، اس کا عنوان یہ تھا کہ گذشتہ چودہ سو سال میں اسلام اور مسلمانوں نے دنیا کو کیا دیا، اس کا افتتاح وزیر اعظم اندرا گاندھی نے کیا جن کا خطبہ عام طور سے بہت پسند کیا گیا، انھوں نے جب یہ کہا کہ اسلام ہمارا مذہب ہے تو یہ آواز ہر طور پر پہلی دفعہ سنی گئی، ورنہ اب تک ہندو مورخین اور خصوصاً ارباب سیاست تو اسی پر زور دیتے رہے کہ یہ ہندو مت، بودھ مت اور جین مت کی طرح اس ملک کا مذہب نہیں، وزیر اعظم کے اس اعلان کے بعد امید ہے کہ اسلام سے متعلق یہاں کے غیر مسلموں کے سوچنے کا ڈھنگ بدل جائے گا، ہماری وزیر اعظم نے بڑی فراخدلی سے اس کا بھی اعتراف کیا کہ ہم ان کارناموں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے جو مسلمانوں نے یہاں آکر تمدن، تہذیب، کلچر، آرٹ اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں انجام دیے، اگر اس فراخدلی اور رواداری کا اظہار ۱۹۴۷ء سے پہلے اور اس کے بعد ہوتا تو اس ملک کی تاریخ کچھ اور ہوتی، امید ہے کہ ہماری وزیر اعظم نے اپنے خطبہ میں ہندوستانی ذہن کو جس طرح جھنجھوڑا ہے، اس کے اچھے اثرات ہی مرتب ہوں گے، افسوس اس کا ہے کہ یہ خطبہ

چھپوا کر تقسیم نہیں کیا گیا، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کے ترجمے مختلف زبانوں میں کر کے عام کئے جائیں،

وزیر اعظم نے اس موقع پر جناب محمد عثمان عارف نقشبندی، نائب وزیر تعمیرات و مکانات، حکومت ہند دہلی کے مجموعۂ کلام **عقیدت کے پھول** کی رسم اجرا بھی کی، جناب عارف صاحب نے ازراہ نوازش بڑے احترام کے ساتھ ایک نسخہ اس خاکسار کو بھی پیش کیا، اس میں زیادہ تر ان کا نعتیہ کلام ہے، جمہوریہ ہند کے نائب صدر جناب ہدایت اللہ صاحب نے اس کے پیش لفظ میں تحریر فرمایا ہے کہ عارف صاحب کے مجموعۂ کلام میں تخیل کی پاکیزگی، درد، اثر اور سوز و تپش پوری طرح موجود ہے، تصوف و اخلاق کے جذبات کا اظہار ضبط و توازن اور احتیاط کے تقاضوں کے ساتھ ہے، انھوں نے اپنی نعت گوئی میں قومی اور اخلاقی مسائل کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے، اسی طرح دوسرے تبصرہ نگار اس پر جو کچھ لکھ سکتے تھے، نائب صدر صاحب ہی نے لکھ کر سب کے خیالات کی ترجمانی کر دی ہے، خود عارف صاحب نے اس کتاب کے شروع میں شاعری بن صنف نعت کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے، اس سے نہ صرف ان کی نعت گوئی کا انداز ظاہر ہوتا ہے، بلکہ ان کے اہل دل ہونے کی بھی غمازی ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ عشق محمدیؐ کا دعوی تو چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی، البتہ یہ ضرور عرض کرونگا کہ نعت کہتے وقت آقائے نامدارؐ کا تصور آتا ہے تو اکثر دل میں طوفان گریہ امڈ کر آنکھیں اشک برسانے لگتی ہیں، پھر اس کے بعد ان کی نعتوں میں تاثیر و نفوذ کی کیفیت کیوں نہ پیدا ہو، ان کی نعت کا ایک شعر یہ بھی ہے،

بڑی مشکل میں ہے امت کرم فرمائیے اس پر
خدارا یا رسول اللہ خدارا یا رسول اللہ

ایسی آواز ہندوستان کی حکومت کی مسند وزارت پر بیٹھنے والے کے منہ سے شاید پہلی دفعہ سنی گئی، اور یہ وہی کہہ سکتا ہے جو واقعی صاحب ایمان و ایقان ہو۔

اس سمینار کی دوسری نشست کو مولانا ابوالحسن علی ندوی نے مخاطب کیا، جو اس موقع پر خاص طور سے مدعو کیے گئے تھے۔ ان کی شیوا بیانی اور ہجرت کی اہمیت کی نکتہ آفرینیوں سے تمام سامعین محظوظ ہوئے۔

اس کی فضا شروع سے آخر تک بڑی خوشگوار رہی، تقریباً ۲۵ مقالات اس کے لئے لکھے گئے کسی مقالہ میں کوئی قابل اعتراض بات نہ تھی، پروفیسر ڈاکٹر بی۔ ان پوری نے بہت ہی موثر انداز میں کہا کہ پولیٹیکل اسلام کچھ اور ہے، اور ریلیجنس اسلام کچھ اور ہے یہ ریلیجنس اسلام کے ذریعہ ہی سے اسلام صحیح معنوں میں سمجھا جا سکتا ہے، جس میں رواداری، فراخدلی، ہمدردی اور انسان دوستی کے سارے پہلو دکھائی دیں گے، ارکشستر یونیورسٹی کے ڈاکٹر اس۔ بی۔ بگم نے فیروز شاہ تغلق کے زمانہ کا ایک فتویٰ پڑھ کر سنایا، جس میں ہندوؤں کے ساتھ پوری رواداری کی ترغیب تھی، بڑودہ یونیورسٹی کے پروفیسر آر۔ ان مہتا نے اُن تمام شہروں اور عمارتوں کی تفصیل بتائی، جو مسلمانوں نے وہاں آباد اور تعمیر کیں پونا کے پروفیسر اے۔ آر۔ کلکارنی نے مرہٹوں کے نظام سلطنت پر اسلام کا جو اثر پڑا، اس کی وضاحت کی، پھر سپریم کورٹ کے جج کرشن آیر نے سارے سامعین کو یہ کہہ کر چونکا دیا۔

"میں نے اسلامی قوانین کا گہرا مطالعہ کیا ہے، پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسلامی قوانین اور صرف اسلامی قوانین ہی دنیا کے لئے بین الاقوامی قوانین بن سکتے ہیں"۔

ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ امریکہ میں ان کو دنیا کا فاضل ترین جج قرار دیا گیا تھا، ان کی یہ رائے نہ صرف اسلامی ممالک بلکہ پوری دنیا میں قابل غور و فکر ہے،

اس سمینار کے آخری اجلاس کو جناب ہدایت اللہ صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند نے بھی

مخاطب کیا، ان کا یہ تحریری خطبہ بھی چھپ کر تقسیم ہونے کے لائق تھا، اس کو سنتے وقت یہ احساس ہو رہا تھا کہ کوئی مسلمان بول رہا ہے، سیکولرزم کی لیپ پوت نہیں کر رہا ہے، ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے آخر میں مہمانوں کا شکریہ ادا کر کے اپنی میٹھی تحریر اور میٹھی آواز میں وہ ساری باتیں کہدیں جو ان کو کہنا چاہئے تھیں۔

خاکسار کا مقالہ انگریزی میں "ہندوستان میں صوفی ازم اس کے مختلف سلسلے، اور اس کے کارنامے" کے عنوان سے تھا، یہ جناب بدرالدین طیب جی کی صدارت میں پڑھا گیا، جن کی کرسی ایک آئی۔ سی۔ ایس کی کرسی بنی ہوئی تھی، وہ مقالہ نگاروں کی سرزنش کرنے میں بالکل تامل نہ کرتے، ایک صاحب کے مقالہ کو تو بالکل irrelevant قرار دیا، میں نے جب اپنا مقالہ ختم کیا تو انھوں نے یہ کہہ کر کہ It is an excellent paper مجھکو بھی چونکا دیا، میں نے اس کو اپنے موضوع کی برکت تصور کیا،

اس سمینار کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ہندوستانی مقالہ نگار لودی ہوٹل میں بڑے آرام سے ٹھہرائے گئے، ان کی ہر طرح کی خاطر تواضع کی گئی، ان کے لئے کئی جگہوں پر شاندار دعوتوں کا بھی انتظام تھا، خود نائب صدر نے حیدرآباد ہاؤس میں ان کو ایک پرتکلف ڈنر دیا، اس سے پہلے کے بین الاقوامی سمیناروں کے ہندوستانی نمایندوں کو ڈیڑھ سو روپیے دیدئے جاتے تھے کہ وہ جہاں چاہیں اپنے قیام و طعام کا انتظام کریں، کبھی ایسا ہوا کہ یہ مجبور اور لاچار مقالہ نگاروں نے خوانچہ والوں کے ذریعہ سے اپنی شکم پری کی، مگر اس سمینار میں قیام و طعام کی نوعیت بدلی ہوئی تھی، البتہ اس میں یہ تفریق ضرور کی گئی کہ بیرونی مہمانوں کے لئے جن سینٹھ ہوٹل میں انتظام کیا گیا، شاید ان کو ہندوستانی نمایندوں سے زیادہ برتر سمجھا گیا، مگر پاکستان کے علاوہ کوئی اور بیرونی مہمان اس سمینار کے لیے نہیں آیا، پاکستان کی عطیہ خلیل صاحبہ (کراچی یونیورسٹی) اپنی تقریروں کی وجہ سے

نمایاں رہیں۔

اجلاس کے بعد مہمانوں کو دہلی اور آگرہ کی تاریخی عمارتوں کی سیر بھی کرائی گئی، اس سمینار کو ہر طرح کامیاب بنانے میں جناب نصر اللہ بیگ صاحب اڈیشنل سکریٹری وزارت تعلیم اور جناب پی۔ آر گرد ور ڈائرکٹر انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ نے انتھک کوشش کی، دونوں حضرات اپنے ستعد رفقاء کے ساتھ مہمانوں کی خاطر تواضع میں بچھے رہے، اگر اس سمینار کے تمام خطبات اور مقالات چھاپ کر شایع کئے گئے تو امید ہے کہ یہ اس ملک کی جذباتی ہم آہنگی میں بہت ہی مفید ثابت ہونگے۔

اس سمینار میں میرے لئے ایک پُر کیف یاد جناب ضیاء الدین احمد ڈیسائی کی رفاقت تھی، ہم دونوں لودی ہوٹل کے ایک کمرے ہی میں ٹھہرے، ان سے پہلے بھی ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں، مگر تین روز کی رفاقت میں انھوں نے اپنی شرافت طبع، عمدہ اخلاق، عزیزانہ خدمت گذاری، بھلمنساہت اور علمی ذوق کا جو ثبوت دیا، اس کی یادوں کی شمع برابر فروزاں رہے گی، وہ اس وقت مرکزی حکومت کی طرف سے ناگپور میں ڈائرکٹر آف ایپی گرافی ہیں، اور وہاں سے ایپی گرافیا انڈیکا کے نام سے انگریزی میں ایک بہت ہی معیاری جرنل نکالتے ہیں جس میں پرانی عمارتوں کے عربی اور فارسی کتبات پر سیر حاصل مضامین ہوتے ہیں، یہ رسالہ دنیا کے بہترین رسالوں میں شمار کرنے کے لائق ہے اس میں زیادہ تر ان ہی کے مضامین ہوتے ہیں، جن سے ان کی شہرت باہر کے ملکوں میں پھیل چکی ہے، وہ گجرات کے رہنے والے ہیں۔

دوسرا بین الاقوامی سمینار اسلام آباد میں نیشنل ہجری سیلیبریشن کے نام سے ہوا، اسکا موضوع تقریباً وہی تھا، جو دہلی کے سمینار کا تھا، یہ ۸ر ۹ر ۱۰ر مارچ کو ہوا۔

ہندوستان سے جو وفد اس کے لیے ہوائی جہاز سے نئی دہلی سے روانہ ہوا، اس میں ہم سفر مولانا سعید احمد اکبرآبادی اڈیٹر برہان، جناب سید اوصاف علی سکریٹری انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

نئی دہلی پروفیسر لالی والا گجرات یونیورسٹی تھے، اور جناب نثار احمد فاروقی دہلی یونیورسٹی تھے، جناب سید اوصاف علی اور نثار احمد فاروقی صاحبان نے سفر میں جو سہولتیں پہونچائیں اس کے لئے انکا ممنون ہوں، پیشاور کے ایک اور سمینار کے بعد ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ڈیسائی اور ڈاکٹر صدیقی سپرنٹنڈنٹ محکمۂ آثار قدیمہ نئی دہلی بھی شریک ہوئے، ہملوگ اسلام آباد ہوٹل میں ٹھہرائے گئے تھے، اسکا ہر کمرہ ٹی۔ وی ریفری جیٹر ریڈیو اور دوسرے جدید سامانوں سے آراستہ و پیراستہ تھا، نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے ایک بڑا ہال بھی تھا۔

یہاں پرانے ملنے والے بڑی گرمجوشی سے ملے، پاکستان کے مشہور وکیل جناب اے۔ کے پروین صدر ضیاء الحق کے کابینہ کے ممتاز ترین وزیر اور ان کے دست راست ہیں، ان ہی کی نگرانی میں یہ سمینار انجام پا رہا تھا، وہ انگریزی زبان اس طرح بولتے ہیں جیسے یہ اُن کی مادری زبان ہے، اس زبان میں شاید دنیا کے بہترین مقرروں میں ہیں، اسلامی علوم و فنون پر بھی اچھی نظر رکھتے ہیں اسکے کسی پہلو پر بولتے ہیں تو اپنی شان خطابت سے خاص رنگ پیدا کر دیتے ہیں، انھوں نے دار المصنفین کے کام کے سلسلہ میں ۱۹۷۶ء میں بڑی مدد فرمائی تھی، ہوٹل میں ان کی نظر مجھ پر پڑی تو اپنی دل آویز مسکراہٹوں کے ساتھ میری طرف بڑھے، پھر دیر تک باتیں ہوتی رہیں، ان سے دہلی کے بین الاقوامی سمینار میں مسز اندرا گاندھی کے افتتاحی خطبہ اور اسلامی قوانین سے متعلق مسٹر کرشنا آئر کی رائے کا ذکر کیا، تو سن کر خوش ہوئے۔

یہیں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ سے ملاقاتیں رہیں، اس وقت اسلام آباد کی اسلامیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں، ۱۹۷۷ء اور ۱۹۷۸ء میں دار المصنفین کے کام کے سلسلہ میں غیر معمولی مدد پہونچائی تھی، شریفانہ اخلاق و مروت کے پیکر ہیں، اپنے اوصاف کی عطر بیزیوں سے معطر معطر ہو کر ملے، باتیں کرتے وقت گلاب کی پنکھڑیاں فضا میں بکھرتے نظر آتے ہیں، خاطرداری کی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی،

جناب عبدالواحد ہالی پوتا ڈائرکٹر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ملے تو ایسا محسوس ہوا کہ سنجیدگی، متانت اور دینداری متحرک ہے، محبت اور لینت کے سارے جلوے ان کی ملاقاتوں میں جگمگاتے رہتے ہیں،

پروفیسر ڈاکٹر منظور احمد کراچی یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر ہیں اس سمینار کے جنرل سکریٹری تھے، مجھکو دیکھتے ہی والہانہ انداز میں تجدید ملاقات کے لئے میری طرف بڑھے، بڑی اچھی انتظامی صلاحیت رکھتے ہیں، تقریب کو کامیاب بنانے میں چھلاوہ کی طرح ہر طرف دکھائی دیتے، اچھے مقرر بھی ہیں۔

اس ہجری نیشنل کمیٹی کے سکریٹری جناب بی۔ ایس گھانگرو تھے، جو حکومت پاکستان کے محکمہ قانون کے اڈیشنل سکریٹری بھی ہیں، وہ بھی تمام مہمانوں کی پذیرائی کے لیے پیش پیش رہے، ان کی چھوٹی بڑی ضرورتوں کو بڑی خندہ پیشانی سے پورا کیا، بہت ہی جامہ زیب ہیں، مختلف لباسوں میں نظر آتے اور بھلے معلوم ہوتے۔

اقبال اکیڈمی لاہور کے ڈائرکٹر ڈاکٹر معز الدین ملتے ہی گلے سے لپٹ گئے، وہ میرے استاد پروفیسر محمد مسلم کے داماد ہیں، اسی تعلق سے عزیزانہ لگاؤ رکھتے ہیں، اقبال اکیڈمی کی کارکردگی کی وجہ سے مقبول ہیں، ان کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں اقبال چیر کے وزیٹنگ پروفیسر ہو کر جانے والے ہیں، یہ سن کر خوشی ہوئی کہ ان کی صلاحیت کا اس طرح اعتراف کیا گیا ہے،

اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے رسالہ فکر و نظر کے اڈیٹر ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی نے اپنی ملاقاتوں میں وہی گرم جوشی دکھائی جس کی توقع ان سے تھی، اس انسٹی ٹیوٹ کے پروفیسر عبدالرحمٰن سورتی اپنی محبت میں کمرہ میں آکر ملے، اسی ادارہ کے ریسرچ فیلو حافظ محمود الغازی تو سایہ کی طرح ساتھ رہ کر اسی سعادت مندی کا ثبوت دیا جو ایک قریبی عزیز دے سکتا ہے، ان کے چھوٹے بھائی حافظ محمد غزالی اپنی ذہانت سے متاثر کئے بغیر نہیں رہے، ان ہی کے ساتھ سعودی عرب کے اخبارات کے نامہ نگار جناب حسان کلیمی اپنے متعلقوں کے پریم تیبی کے ساتھ آکر ملے، اور اپنی

بھلمناہت کے خوشگوار اثرات چھوڑ گئے، میرے عزیز مصباح الہدیٰ حکومت پاکستان کی انفارمیشن کے محکمہ کے ڈپٹی ڈائرکٹر ہیں، دار المصنفین کے کام کے سلسلہ میں ان کے یہاں مہینوں قیام کیا تھا، وہ بھی کمرے پر ملنے آئے ان کی میزبانی اور تواضع کی یاد تازہ ہو گئی،

لندن سے ایک پندرہ روزہ اخبار امپیکٹ نکلتا ہے، جو دار المصنفین میں پابندی سے آتا ہے، اس کی انگریزی زبان بہت معیاری ہوتی ہے، اس کے سیاسی مضامین میں اسلامی حمیت و غیرت کا رنگ بھرا ہوتا ہے، اس کے اڈیٹر جناب اے۔ عرفان صاحب ہیں، خیال تھا کہ کوئی صاحب قسم کے اڈیٹر ہوں گے، ایک روز وہ میری شیروانی اور ٹوپی دیکھ کر یہ کہتے ہوئے بڑھے کہ آپ دار المصنفین سے تو نہیں آئے، وہ اپنے چہرے سے متین، سنجیدہ اور دیندار مسلمان نظر آتے، انھوں نے بتایا کہ اُن کا آبائی وطن غازی پور ہے، یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اسی دیار سے انگریزی صحافت نگاری کے ذریعہ بھی ایک اچھی خدمت ہو رہی ہے، پھر بار بار ان سے ملنے کو جی چاہا، وہ معارف کے بڑے قدرداں بھی نکلے۔

ایک روز میرے کمرے میں ایک صاحب داخل ہوتے ہوئے بولے کہ میرا نام اختر امام ہے، میں لنکا سے آیا ہوں پھر تو دیر تک ان کو سینے سے چمٹائے رکھا، وہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے ساتھی ہیں، معارف کے ناظرین ان سے واقف ہوں گے، انھوں نے بہت سے خطوط جرمنی، لنکا، بغداد اور ماسکو سے لکھے جو اس میں چھپتے رہے، بہار کے رہنے والے تھے، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں تعلیم پائی، پھر جرمنی جا کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، وہاں سے آئے تو لنکا یونیورسٹی میں عربی کے استاد ہو گئے، ترقی کر کے اس شعبہ کے صدر ہو گئے، پھر پاکستان کے سفارتی عہدوں پر فائز رہے، لنکا یونیورسٹی سے ریٹائر ہو کر وہیں کے باشندے ہو گئے ہیں، تقریباً ۳۰ سال کے بعد ملاقات ہوئی، پھر تو ان کے ساتھ بڑے اچھے دن گذرے، پرانی ساری باتیں دہرائی گئیں، وہ بڑی دل آویز اور دل پذیر گفتگو کرتے ہیں، ایک ہی سانس میں تبنی ، خطیب، ابن خلکان، طبری، اثیر، شبلی، سلیمان، دار المصنفین

حافظ، خیام، اصغر، حسرت، فانی سب ہی پر باتیں کرتے رہے، اشعار سنانے پر آتے ہیں تو سناتے چلے جاتے ہیں، ان کی ہر بات سے اخلاص و محبت کے آبدار موتی جھڑتے رہے۔

میرے کمرے کے بغل میں بنگلہ دیش کے جناب سجاد حسین صاحب ٹھہرے ہوئے تھے، ان سے باتیں ہونے لگیں تو بتایا کہ وہ مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، شیخ مجیب الرحمٰن ان کو پسند نہیں کرتے تھے، اس لئے ان کی مکتی باہنی نے ان کو ایک روز بڑی بے رحمی سے مار کر کہیں پھینک دیا، مگر ان کی زندگی تھی، اس لئے کسی نے ان کو اسپتال پہونچا دیا، وہ اپنے کاری زخموں کے باوجود بچ گئے، وہ کچھ لنگ کھا کر چلتے دکھائی دیتے جو اسی مار کا اثر ہے، ان کے اہل و عیال تو بنگلہ دیش میں رہے ہیں مگر وہ خود مکہ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر ہیں، وہیں سے سمینار میں آئے، ایک اجلاس کی صدارت بھی کی۔

ایک روز نائجیریا کے نمائندہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالرحمٰن دوائی خاص طور سے ملے، گجرات کے رہنے والے ہیں، مگر نائجیریا کے شہری ہوگئے ہیں، وہاں کی یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں، عربی اسی لب ولہجہ میں بولتے ہیں، ان کو انگریزی اور اردو بولنے میں بھی بڑی مہارت ہے، بڑا گہرا مذہبی رنگ چڑھا ہوا ہے، معارف برابر پڑھتے رہتے ہیں، انھوں نے بھی ایک روز سمینار کے ایک اجلاس کی صدارت کی۔

ایک روز صبح ناشتہ کی میز پر بیٹھا تھا کہ امریکہ کے ٹی. بی. ارونگ آکر بیٹھ گئے، انھوں نے کلام پاک کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے، ان کی باتوں سے پتہ چلا کہ ان کے کام کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی نہیں ہوئی، لیکن اس سمینار میں ان کو بھی ایک اجلاس کی صدارت دی گئی،

ہمدرد فونڈیشن کے جناب حکیم محمد سعید سے بھی نیاز حاصل ہوا، جو حسب معمول اپنے بے داغ سفید لباس میں خود منور نظر آرہے تھے، ان کی ہر ادا دلکش اور ہر بات دل نواز ہوتی ہے، مجھ پر ان کے ذاتی احسانات بہت کچھ ہیں، اس لئے ان سے اس بار سے مجھ کا ہوا ملا، مگر وہ خود

انکسار اور تواضع سے پیش آئے، وہ بڑے علم نواز بھی ہیں، اپنی علم نوازی میں اکبری دور کے حکیم ابوالفتح گیلانی کی یاد تازہ کرتے ہیں، ان کے ساتھ جناب برکات احمد صاحب ریٹائرڈ آئی۔ اے۔ ایس بھی تھے، اپنی ملازمت کے زمانہ میں ہندوستان کی طرف سے سفارت کی خدمت بھی انجام دے چکے ہیں، محمد اینڈ دی جیوز کے مصنف بھی ہیں، اچھا علمی ذوق رکھتے ہیں، حکیم محمد سعید کے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید (مالک ہمدرد دواخانہ دہلی) کے بھی بڑے اچھے دوست ہیں، اس زمانہ میں اسلام آباد آئے ہوئے تھے۔

پنجاب یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم سے بھی برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، وہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے داماد ہیں، آج کل اپنی تحقیقی تحریروں کی وجہ سے اس برصغیر کی علمی فضا پر چھائے ہوئے ہیں، ان کے ملنے جلنے کے انداز میں عزیزانہ محبت اور گرم جوشی رہی۔

اس تقریب میں جناب شریف المجاہد ڈائرکٹر قائد اعظم اکیڈمی کراچی اور ڈاکٹر انعام الحق کوثر چیرمین انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن بورڈ بلوچستان سے مل کر بھی پرانی یادیں تازہ ہوگئیں، جناب نذیر احمد صاحب پہلے پاکستان کے محکمہ تعلیم میں ڈپٹی سکریٹری تھے، دارالمصنفین کے کام کے سلسلہ میں بڑی مدد پہونچائی تھی، پھر وہ لندن چلے گئے تھے، وہاں سے ان ہی دنوں واپس آگئے تھے، ایک ڈنر میں ان سے ملاقات ہوئی تو وہ بھی بڑی محبت سے پیش آئے، اسی ڈنر میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ریسرچ فیلو محمد فاضل شمسی نے بھی ہر طرح کی خاطر تواضع کی۔

معلوم ہوا کہ اس سمینار کے انتظام و انصرام میں تقریباً ایک کروڑ روپے خرچ ہوئے ہیں، اسی سے اس کے کر و فر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، افتتاح کی رسم جناب صدر ضیاء الحق نے پاکستان کی روایتی شان [illegible] کی، ان کا خطبہ اردو میں تھا، اس میں یہ تلقین کی گئی کہ اب تک اسلامی علوم وفنون میں جو کچھ کام ہو چکا اسی پر اکتفا کرنا مناسب نہیں، بلکہ آیندہ نئے ولولے اور نئے جوش کے ساتھ

اس سے زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے، نمایندوں کی بہت بڑی تعداد جلسہ میں موجود تھی تقریباً تمام اسلامی ممالک کی نمایندگی تھی، کوئی غیر مسلم نمایندہ نہ تھا، حالانکہ ایسے موقع پر ان کی زبان سے بھی کچھ سننا فائدے سے خالی نہیں ہوتا، ہندوستان کے سمینار میں زیادہ تر غیر مسلم ہی تھے، انھوں نے اسلام، اسلامی تاریخ اور اسلامی کلچر سے متعلق جو اپنے مفید خیالات کا اظہار کیا، اس سے سمینار میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی تھی،

افتتاح کے بعد چائے نوشی کے اجتماع میں جناب صدر ضیاء الحق خصوصی توجہ کے ساتھ اس خاکسار سے بھی ملے، میں نے ان سے عرض کیا کہ ہماری وزیر اعظم نے اسی قسم کے سمینار میں جو تقریر کی وہ آپ کی نظر سے گذری کہ نہیں، انھوں نے فرمایا کہ اخبار میں جتنی چھپی وہی پڑھی، پھر عرض کیا کہ یہ پوری تقریر پڑھنے کے لائق ہے، اس سے ہندوستان کے اندر ایک نیا باب شروع ہونے والا ہے، امید ہے کہ دونوں پڑوسی ملکوں کے اچھے تعلقات میں بھی اضافہ ہو جائے گا، فرمایا کہ اس کو منگوا کر پڑھونگا، مولانا ابو الحسن علی ندوی سے متعلق بھی باتیں ہوئیں، ان باتوں میں جناب اے۔ کے بروہی صاحب بھی آکر شریک ہو گئے، وہ میری تصانیف کا ذکر جناب صدر صاحب سے کرنے لگے، جنھوں نے غایت تواضع میں اپنی چائے کی پیالی میری طرف بڑھا کر نوازا۔

اس موقع پر بڑا اہم منظر وہ تھا جب صدر صاحب سے مولانا سعید احمد اکبر آبادی ملے، وہ صدر صاحب کے استاد سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں رہ چکے تھے، صدر صاحب نے اپنے استاد کے احترام میں ان سے معانقہ کیا، دیر تک باتیں کرتے رہے، پھر اپنے یہاں خصوصی مہمان کی حیثیت سے قیام کرنے کے لیے مدعو کیا، جس کو مولانا نے شکریہ کے ساتھ منظور کیا۔

سمینار کے دو حصے کر دیے گئے تھے، بکثرت مقالات آئے تھے جن کو چھاپ کر سات جلدوں میں تقسیم کر دیئے گئے تھے سمینار کے منتظمین اپنی اس کارکردگی اور مستعدی کے لیے مبارکباد کے

مستحق ہیں، مگر ان میں مقالہ نگاروں کا تعارف نہیں، جس سے ایک بڑی کمی محسوس ہوئی، ایک سیکشن کے ایک اجلاس کی صدارت مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے بھی کی جن کی صدارتی تقریر پسند کی گئی، مولانا ابو الحسن علی ندوی کے لیے بھی ایک اجلاس کی صدارت کا اعلان تھا، مگر وہ تشریف نہیں لا سکے تھے۔

عرب مندوبین کے مقالات عربی میں تھے، عربی سے اردو اور انگریزی، اسی طرح اردو اور انگریزی کے عربی ترجمے کا انتظام خاطر خواہ تھا جو آلۂ سماعت کے ذریعہ سے سنے جا سکتے تھے، عرب مندوبین مباحثے میں زیادہ حصے لیتے رہے، مگر جب ہندوستانی مندوبین میں سے پروفیسر لالی والا کی انگریزی تقریر بینک کے غیر سودی نظام پر ہوئی تو مجمع سے تحسین و آفریں کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں کہ ایک غیر اسلامی ملک کا نمایندہ ایسی تقریر پیش کر رہا ہے، ان سے ٹیلی ویژن پر بھی اس قسم کی تقریر کرائی گئی،

راقم کا مقالہ انگریزی میں "اسلام میں تعدد ریاست نظری اور عملی حیثیت سے" کے عنوان سے تھا، اس موضوع پر ہندوستان میں بارہا اپنے خیالات کا اظہار کر چکا تھا، اس بین الاسلامی مجمع میں اس مقالہ کو پیش کرنے کا مقصد صرف اس کے رد عمل سے واقف ہونا تھا، کلام پاک اور احادیث کے حوالے پر مشتمل یہ اچھا خاصہ طویل تھا، اس کا خلاصہ یہ ہے،

ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر شعبۂ زندگی کی جزوی باتوں کی واضح تعلیم دی ہے، مگر طرز حکومت اور اس کی تشکیل کو بالکل غیر واضح چھوڑ دیا ہے، حکومت جغرافیائی حالات، ماحول اور زمانہ کے تحت بدلتی رہتی ہے، اس لیے طرز حکومت اور اس کی تشکیل کا غیر واضح رہنا ہی مناسب تھا، کہ جب جیسی ضرورت ہو، اسی کے مطابق حکومت بنائی جائے البتہ حکومت کے لیے کچھ بنیادی باتیں ایسی ہیں جو ہر زمانہ ہر ملک اور ہر ماحول کے لیے لازمی ہیں، ان کی وضاحت ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دی ہے، جس سے ایک قابل فخر ویلفیر اسٹیٹ بن سکتی ہے اگر ان بنیادی باتوں پر عمل کر کے کوئی حکومت

قائم کی جاتی ہے، تو اس کی نوعیت خواہ بادشاہت یا جمہوریت یا عوامی جمہوریت یا آمریت ہی کیوں نہ ہو وہ اسلامی حکومت کہی جا سکتی ہے، ہمارے سامنے خلافت راشدہ کا نمونہ ہے، لیکن اس کی حکومت کی نوعیت کا متعین کرنا آسان نہیں، کوئی اسکو اوتاری، کوئی مذہبی، کوئی زعیمی، کوئی دستوری کوئی جمہوری، کوئی اوتاری اور جمہوری، کوئی بادشاہی اور جمہوری حکومت کی ملی جلی شکل بتاتا ہے، یہ سب کچھ تھی، مگر ان سب کی برائیوں سے پاک اور ان کی تمام خوبیوں کی حامل تھی، اسلئے یہ بہترین حکومت تھی، خلفائے راشدین کا انتخاب ضرور ہوتا رہا، مگر ان کے طرز انتخاب سے خاص ضابطے متعین نہیں کئے جا سکتے، کلام پاک میں شوریٰ کی اہمیت ضرور ہے، لیکن جمہوریت کا ذکر نہیں، اسلام حکومت کی ظاہری شکل یعنی انتخاب کے طریقے، ارباب شوریٰ کی ترتیب اور ان کے فرائض و حقوق، ان کے انتخاب، اظہار رائے کے طریقے وغیرہ کی کوئی اہمیت نہیں دیتا اس کے نزدیک اصل چیز حکومت کے امیر و رئیس اور اس کے ارکان و عمال کا تقویٰ ہے،

اگر کوئی سربراہ حکومت خواہ وہ بادشاہ یا آمر ہی کیوں نہ ہو، اللہ تعالےٰ کے حکم اور منشاء حکومت کا نفاذ کر کے اسلامی شعار، اسلامی حمیت اور اسلامی غیرت کی نگہبانی اور پشتیبانی کر کے اسلام کی شان اور آن بان میں اضافہ کرنے کا کوشاں رہا ہو یا ہو، تو کیا وہ جمہوری حکومتوں کے ان سربراہوں سے فروتر سمجھے جائیں گے، جو ظالم، فاسق اور فاجر ہوں، لیکن ان کی حکومت کا حق صرف اس لئے ہو کہ وہ عوام کے ووٹوں سے برسر اقتدار آئے ہیں، یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد خاندانی حکومتیں ضرور قائم ہوتی رہیں لیکن ان کے سربراہوں نے اسلام کے قوانین کی بالادستی کو اپنی حکومت میں شعوری یا غیر شعوری طور پر برقرار رکھا تو کیا ان کی حکومتیں خارج از اسلام محض اس لئے سمجھی جائیں گی کہ وہ خلافت راشدہ کے طرز پر نہیں، تو پھر اسلام کی سیاسی تاریخ ہمارے پاس کیا رہ جاتی ہے حالانکہ

ہم کو ان کے بہت سے کارناموں پر فخر ہے،

اس مقالہ کو پڑھتے وقت سامعین کی طرف برابر نظر اٹھتی رہی، اندازہ ہوا کہ ان کے جذبات میں کچھ ہلچل پیدا ہو رہی ہے، اپنی جگہ پر آکر بیٹھا تو ایک صاحب نے کہا کہ آپ نے تو مجمع کو لوٹ لیا، سنگاپور کے ایک نمایندہ نے کہا کہ It is a wonderful paper پھر اس پر بحث بھی شروع ہو گئی میں جواب دیتا رہا، کچھ معترضین تو مطمئن ہوئے، اور کچھ غیر مطمئن رہے، اجلاس ختم ہوا تو جناب حکیم سعید صاحب نے ازراہ نوازش میرے پاس آنے کی زحمت گوارا کی فرمایا آپ یہ مقالہ مجھکو دیدیں، عرض کیا وہ کیا کریں گے، فرمایا پھر بتاؤنگا، دوسرے دن ملاقات ہوئی تو فرمایا کہ یہ مقالہ صدر صاحب کے ہاتھ میں خود دے کر آیا ہوں، عرض کیا یہ اتنا اہم تو نہ تھا، فرمایا اس کی اہمیت کا اندازہ دوسروں کو ہے،

ایک شام صدر صاحب نے اپنے یہاں تمام مندوبین کو بھی مدعو کیا، ہندوستانی وفد ان سے ملا تو مجھ سے مصافحہ کرتے میں فرمایا آپ کا مقالہ میرے پاس پہونچ گیا ہے، میں نے اس کو غور سے پڑھا، میں نے شکریہ ادا کیا، اسی ملاقات میں جناب سیداوصاف علی نے ان کو یہ کہہ کر دعوت دی کہ جب کبھی وہ دہلی تشریف لائیں تو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز میں بھی تشریف لانے کی زحمت گوارا کریں، میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ اس انسٹی ٹیوٹ کو دیکھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ اکبر نے تو فتح پور سیکری کو اپنے شاہانہ خزانہ کی مدد سے آباد کیا تھا، لیکن حکیم عبدالحمید نے محض اپنی شاہانہ ہمت سے تغلق آباد کے ویرانے کو علم و فن کا ایک چمنستان بنا دیا ہے، انھوں نے دعوت قبول کر لی، رخصت ہوتے وقت عرض کیا کہ آپ کے جسم پر تو آپ کی شیروانی بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہے، مگر یہ شیروانی پاکستان میں بہت ہی کم نظر آتی ہے، فرمایا میں نے تو اس کو قومی لباس بنا دیا ہے، رفتہ رفتہ یہ رائج ہو جائے گی۔

سیمینار کے ساتھ ایک نمائش بھی رکھی گئی تھی، اس میں پاکستان کے اندر ہر زمانہ میں صنعت حرفت، پارچہ بافی، آرٹ، کلچر، فن تعمیرات اور موسیقی وغیرہ کو فروغ دینے کی جو کوششیں ہوئیں اسکو بہت سلیقہ سے دکھایا گیا تھا،

نیشنل بک فونڈیشن اسلام آباد نے دارالمصنفین کی ۱۱۵ مطبوعات کا حق طباعت و اشاعت باضابطہ خرید لیا ہے، اس کا بھی ایک نمائشی اسٹال سیمینار کے ہال کے پاس تھا، اس کی طرف سے دارالمصنفین کی اب تک ۴۲ کتابیں شائع ہوئی ہیں، اس کے مینجنگ ڈائرکٹر جناب رضی الرحمٰن صاحب سے بقیہ مطبوعات کی طباعت اور اشاعت سے متعلق دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔

سیمینار کے آخری اجلاس میں جناب اے۔ کے۔ بروہی کے ہاتھوں سے غیر ملکی مندوبین کو تاج کمپنی کا بہترین چھپا ہوا کلام پاک کا ایک ایک نسخہ ملا جو بہت ہی بابرکت اور کارآمد تحفہ تھا، تقریب کی یادگار میں کانسے کا ایک ایک تمغہ بھی دیا گیا، اقبال کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر ایسا تمغہ سونے کا تھا، معلوم نہیں اس مرتبہ وہ فیاضی کیوں نہیں دکھائی گئی۔

سیمینار دائرہ ادب، اسلامیہ یونیورسٹی، محکمۂ امور خارجہ اور ایوان صدر کی دعوتوں اور مختلف تجویزوں کے ہجوم میں ختم ہوا، تو مقالہ نگاروں کے مقالات کی سات جلدوں کے علاوہ حسب ذیل علمی تحفے بھی مہمانوں کے ساتھ کئے گئے،

(۱) سمپوزیم اون اسلام اینڈ سائنس (۲) انٹرنیشنل اسلامک کانفرنس (۳) ماسٹر پلان اوف اسلامک ریسرچ (۴) ورلڈ اوف اسلام ٹوڈے (۵) پاکستان پنورما (۶) اسٹیٹس آف دی من ان اسلام (۷) برادر ہڈ ان اسلام (۸) ہیگز ان اسلام (۹) ڈائی مینے مزم ان اسلام (۱۰) جسٹس ان اسلام (۱۱) اسلامک لاز ان پاکستان، (۱۲) بجر اسپیٹیٹری سپیچ پریش کانفرس آف مسلم دی من، (۱۳) ٹیکنیکل جنیس آف دی ایسٹ وغیرہ۔

جناب عبدالواحد ہالی پوتہ صاحب ڈائرکٹر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے ایک مخصوص تقریب میں مدعو کرکے اپنے یہاں کی تازہ مطبوعات پیش کیں، وہاں کے لائق لائبریرین ڈاکٹر احمد حسن نے از راہ کرم یہ کتابیں دارالمصنفین ڈاک کے ذریعہ سے بھیجدینے کی زحمت گوارا کی، جو اب یہاں پہونچ گئی ہیں، ان کے کچھ نام یہ ہیں، مجموعۂ قوانین اسلام جلد دوم، سوم، پنجم، مرتبہ ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن الکندی مرتبہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن شاہ ولی مقصود المومنین لبایزید الانصاری، ڈوکٹرین اوف جماع ان اسلام از احمد حسن، الکزنڈر اگینسٹ گیلین اینڈ موشن، اسلام اینڈ سیکولرزم ان پوسٹ کمالسٹ ٹرکی از محمد رشید فیروز لینڈ لا، ڈ اینڈ پلیزنٹ ان ارلی اسلام" از ضیاء الحق، اسلامک لیگل فلاسفی، از محمد خالد مسعود ارلی ڈیولپمنٹ آف اسلامک جورس پروڈنس از احمد حسن

جناب اے۔ کے۔ بروہی کے الطاف و اکرام کی بدولت یہ تواضع کی گئی کہ مندوبین پاکستان کے جس حصہ میں جانا چاہیں، سرکاری اخراجات پر جا سکتے ہیں، اس کے بعد میں کراچی پہونچ گیا، وہاں کے ارباب علم سے مل کر اپنی زندگی میں اور بھی تازگی پائی، پاکستان کے پرنس اسکار جناب پیر حسام الدین راشدی صاحب سے دو برس کے بعد بغل گیر ہوا تو معلوم ہوتا تھا، کہ علم و محبت کی بہت بڑی دولت آغوش میں سمیٹ رہا ہوں، ان ہی کے یہاں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ڈیسائی اسلام آباد سے آکر ٹھہرے، پھر تو بڑی اچھی صحبت رہی، پیر صاحب نے اپنے غیر معمولی جذبۂ میزبانی اور علم دوستی میں ایک رات کراچی کے کچھ ممتاز ارباب علم کو اپنے یہاں مدعو کیا تو ان کا گھر ایک علمی میکدہ بن گیا جہاں کی شبستان عیش میں ایسا معلوم ہوا کہ پیر صاحب پئے ہوئے ہیں، پلا رہے ہیں، قدم قدم پر نئے گل کھلا رہے ہیں،

جناب سید حسام الدین راشدی صاحب اب تک اتنی کتابوں کے مصنف اور مرتب ہو چکے ہیں کہ شاید ان سب کے نام بھی ان کو یاد نہ ہوں کوئی اور ان کا شمار کرنا چاہے تو قلم دوات کے سہارے ہی کر سکتا ہے ان کو

تذکروں سے لگاؤ نہیں، شاید عشق ہے، مقالات الشعراء از قانع ٹھٹھوی، تکملہ مقالات الشعراء از خلیل ٹھٹھوی، تذکرۂ حدیقۃ الاولیاء از عبدالقادر ٹھٹھوی، تذکرہ شعرائے کشمیر از میرزا محمد اصلح، تذکرۂ روضۃ السلاطین، اور تذکرۂ جواہر العجائب از فخر ہروی وغیرہ ایڈٹ کر کے اس فن کا معیار بہت اونچا کر دیا ہے، ان کو ایڈٹ کرنے میں انھوں نے جو محنت، مشقت اور ریاضت کی ہے اس سے تذکرہ نگار تو دب کر رہ جاتے ہیں، مگر وہ خود اپنے مقدمے، تعلیقات، پھر شعراء کے حالات و آثار کے اضافے سے ایسے ابھر کر سامنے آجاتے ہیں کہ قارئین کے ذہن و دماغ پر تذکرہ نگار کے بجائے وہی چھائے ہوئے رہتے ہیں، میرا خیال ہے کہ تذکرۂ شعرائے کشمیر ان کی علمی سرگرمیوں کا شاہکار ہے، اس میں تقریباً ۳۰۵ فارسی کے شعراء کا ذکر ہے، اس کی مختلف جلدوں میں ان شعراء کے متعلق اتنے مواد جمع کر دیے گئے ہیں کہ پھر کسی اور تذکرہ کو دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ان کی اور تصانیف ہیں، ان کی "میرزا غازی بیگ ترخان اور اس کی بزم ادب" بھی مجھ کو بہت پسند ہے، اس کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ علامہ شبلیؒ کے مزار کے پاس دارالمصنفین میں بیٹھ کر لکھے ہیں، تحریر کا اسلوب اور تحقیق کا انداز وہی ہے جو بستان شبلی کا ہے، غازی خان ترخان جہانگیر کی طرف سے سندھ سے لیکر قندھار تک کا حکمراں جا رہا، ۲۵ سال کی عمر میں وفات پا گیا، مگر اپنی علم دوستی، سخن پروری، زر پاشی کا ایک افسانہ چھوڑ گیا ہے، جو فسانۂ عجائب سے کم نہیں، وہ اپنے دور کا عبدالرحیم خانخاناں تھا، اگر اور زندہ رہتا تو عبدالرحیم خانخاناں کی معارف پروری کی داستان بھی اس کے سامنے ماند پڑ جاتی، جو خدمت ملا عبدالباقی نہاوندی نے مآثر رحیمی لکھ کر انجام دی، وہی راشدی صاحب نے اپنی یہ کتاب قلمبند کر کے دی ہے، مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ ملا عبدالباقی نہاوندی کی تحریروں میں درباری رنگ ہے، لیکن راشدی صاحب کی تحریروں میں بیسویں صدی کا تصنیفی شعور و سلیقہ نمایاں ہے، اس کا مطالعہ کرتے وقت کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی دلچسپ افسانہ پڑھ رہے ہیں، اس کا انداز بیان ہی کچھ ایسا ہے، راقم نے بزم تیموریہ کی دوسری جلد میں اس سے ہر طرح استفادہ کیا ہے۔

راشدی صاحب کی دعوت میں کراچی یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر ریاض الاسلام سے ملاقات ہوئی، جو بہت سی کتابیں لکھ چکے ہیں، ابھی حال ہی میں انھوں نے دو کتابیں ایڈٹ کی ہیں، ایک تو محمود بن امیر بلخی کے سفرنامہ

ہند و پاکستان بحر الاسرار فی مناقب الاخیار اور ایک اے کلنڈر آف ڈوکومنٹز آن انڈو پرشین ریلیشنز ہے۔ یہیں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اپنے ادارہ ترقی اردو بورڈ میں مدعو کیا، یہیں پروفیسر ڈاکٹر ایوب قادری ملے، جو فارسی سے اردو میں ترجمے کرنے میں بڑے ماہر ہیں، تاریخ ہند کی بہت سی کتابیں مثلاً مآثر الامراء، اور طبقات اکبری وغیرہ کے اردو ترجمے کر چکے ہیں، ان کے بھائی ابو معاذ کو دارالمصنفین سے بڑا گہرا لگاؤ رہا، انھوں نے اس کے کتب خانہ کے لئے پاکستان کی بے شمار مطبوعات فراہم کیں، وہ دارالمصنفین بھی آئے، اور اس کے لائف ممبر بھی بن گئے، اور جب یہ سطریں قلمبند ہو رہی تھیں تو پروفیسر ایوب قادری نے اطلاع دی کہ وہ ایک ایکسیڈنٹ میں زخمی ہو کر اللہ کو پیارے ہوئے، یہ معلوم کر کے بڑا دکھ اور رنج ہوا کہ دارالمصنفین کا ایک بڑا ہمدرد جنت کو سدھارا، دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت کریں، آمین

ایک روز پیر حسام الدین راشدی صاحب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ڈیسائی اور پاکستان کے آثار قدیمہ کے سپرنٹنڈنٹ جناب خورشید حسن کے ساتھ ٹھٹھہ لے گئے، جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب اور جہاں کسی زمانہ میں چار سو درسگاہیں تھیں، مگر اب وہاں لوگ زیادہ تر مکلی کے گورستان شاہی کے کھنڈرات کی زیارت کو جاتے ہیں، جو چھ میل میں پھیلے ہوئے ہیں، چند گھنٹوں میں ایک سرسری نظر ہی میں سندھ کے حکمرانوں، شہزادوں، گورنروں، وزیروں، روحانی پیشواؤں اور شاعروں کے مزارات دیکھے، یہاں دفن ہونا بھی بڑا امتیاز تھا، اب یہ ساری عمارتیں عبرت کی جگہیں بنی ہوئی ہیں، ان میں تین دور کی عمارتیں ہیں، سمہ عہد کے مقبروں میں جام نظام الدین، مبارک خان، ملک راج پال کے مزارات ہیں، ترخانی اور ارغونی دور کے ممتاز لوگوں میں عیسیٰ خان ترخان، باقی بیگ ترخان اور سلطان ابراہیم وغیرہ کے مقبرے ہیں، مغلوں کے زمانہ کے لوگوں میں جانی بیگ ترخان، غازی بیگ ترخان، باقی بیگ ازبک، طغرل بیگ، عیسیٰ خان ترخان ثانی، جان بابا اور دیوان شرفا کے مقبرے ہیں، ان میں

دمنتوں اور پتھروں کے علاوہ سفید اور نیلے ٹائل، کاشی کاری اور منبت کاری کے اچھے نمونے بھی دکھائی دیے، گفتگو آ گئی کہ ان عمارتوں میں کہاں کے اثرات زیادہ ہیں، پاکستان کے پروفیسر دانی کا خیال ہے کہ ان پر وسط ایشیا کے فن تعمیرات کے اثرات زیادہ ہیں، مگر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ڈیسائی نے بتایا کہ گجرات کے اثرات زیادہ ہیں، اس کی تائید جناب پیر حسام الدین راشدی نے بھی کی، ان کی بعض عمارتوں میں قرآنی آیتیں بڑی ماہرانہ خوبصورتی سے کندہ تھیں جن پر یقیناً وسط ایشیا کے اثرات تھے، پتھروں کی صناعی اور بعض ستونوں اور کھمبوں میں فتح پور سیکری کے محلات کے اثرات تھے، سورج مکھی کے پھول، سواستیکا اور سکھر وغیرہ ہندوؤں کے اثرات کی غمازی کر رہے تھے، ان عمارتوں پر جناب پیر حسام الدین راشدی کی ایک کتاب سندھی زبان میں مکلی نامہ کے نام سے شایع ہوئی ہے جس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، میری یہ تحریر تو محض ایک طائرانہ نگاہ پر مبنی ہے، میرے لیے زیادہ جاذب نظر اور دیدہ زیب شاہجہانی مسجد تھی جو مکلی ٹیلے سے الگ ٹھٹھ شہر میں واقع ہے، شاہجہاں کی بنوائی ہوئی تمام مسجدوں سے اس کی شان بہت مختلف تھی، مجھ کو ایسا معلوم ہوا کہ ایک پردہ نشین حسین اور حیادار خاتون نظروں کے سامنے ہے، اس کے اوپر ترانوے (۹۳) چھوٹے چھوٹے گنبد ہیں جن سے پوری مسجد میں آواز گونجتی رہتی ہے اس میں سفید ٹائل، موزیک، کاشی کاری اور منبت کاری کی بہاریں پورے حسن کے ساتھ دیکھنے میں آئیں، اس کی تعمیر نواب عبدالبقا خاں کی نگرانی میں ۱۶۴۴ء میں شروع ہوئی اور ۱۶۵۷ء تک اس میں کام ہوتا رہا۔

ٹھٹھ سے واپسی میں ہم لوگ ایک ایسی جگہ رکے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دیبل ہے اور یہیں محمد بن قاسم لنگر انداز ہوا، یہ اس وقت ایک بلند ٹیلے پر واقع ہے، وہاں اس زمانہ کے آثار کا ایک میوزیم بھی ہے، اس میں ایک کتاب وادیٔ سندھ کی تہذیب دیکھی، خورشید حسن صاحب نے اس کا نسخہ بھیج کر ممنون کیا، بعد میں جناب پیر حسام الدین راشدی پورے یقین کے ساتھ بولے کہ یہ دیبل ہرگز نہیں ہے، دیبل کی جائے وقوع کہیں اور ہے۔

ایک رات دیر تک پیر صاحب کے لکھنے پڑھنے کے گوشۂ عافیت میں ان کے ساتھ کتابوں سے ہم کنار رہ کر علمی ہم نوائی کی کیفیت محسوس کی، انھوں نے ایک کتاب تذکرہ مجمع الشعرای جہانگیر شاہی از ملا قاطعی ہروی بھی

عنایت کی، جس کو ڈاکٹر محمد سلیم اختر نے ایڈٹ کیا ہے، میں نے عرض کیا کہ بزم تیموریہ میں اضافہ کر کے اس کو اب تین جلدوں میں شایع کیا ہے، مگر جتنا اضافہ کرتا ہوں نئے تذکرے سامنے آجاتے ہیں تو وہ پہلے کی طرح ناقص ہی معلوم ہوتی ہے

ایک روز ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے ترقی اردو بورڈ کے دفتر میں مدعو کیا، ان کا سن جتنا بڑھتا جاتا ہے جوان ہوتے جاتے ہیں، وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں، مگر مجھ کو ان کی اقبال اور تصوف زیادہ پسند ہے جس میں وہ اہل نظر ہونے کے ساتھ اہل دل کی حیثیت سے بھی سامنے آئے، وہ کراچی یونیورسٹی میں تاحیات اردو کے پروفیسر ہونے کے ساتھ ترقی اردو بورڈ کراچی کے بھی ڈائرکٹر ہیں، "اردو لغت تاریخی اصول پر" کا کام ان ہی کی نگرانی میں ہو رہا ہے، اس کی دو جلدیں تو مکمل ہو چکی ہیں، تیسری جلد کی بھی تکمیل ہو چکی ہے، پہلی جلد پہلے عنایت کر چکے تھے دوسری اس مرتبہ نذر کی، اگر اس کی ساری جلدیں مکمل ہو کر شایع ہو گئیں تو لغت نگاری میں اردو زبان دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں دوش بدوش ہو جائے گی، امید کہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی جواں ہمتی اور اولو العزمی سے یہ کام جلد از جلد پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے گا، اس کے دفتر میں پروفیسر ابوالخیر کشفی، جناب راز مراد آبادی اور جناب لطف اللہ خاں صاحب بھی پہونچ گئے تھے، پھر تو ایک اچھی ادبی مجلس ہو گئی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے یہ بھی بتایا کہ انھوں نے نستعلیق اردو کا ایک ٹائپ بھی تیار کرایا ہے، جو بہت جلد پاکستان میں رائج ہو جائے گا اور اس کی قیمت چھ سو روپیے سے زیادہ نہ رکھی جائے گی، از راہ نوازش دار المصنفین کو بھی یہ ٹائپ نذر کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

پروفیسر ابوالخیر کشفی نے یہیں یہ خوشخبری دی کہ کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں سیرۃ النبیؐ کی چھ جلدوں اور میری ناچیز تصنیف غالب مدح و قدح کی روشنی میں، کے مکمل اشاریے تیار کیے گئے ہیں، اس کو سن کر میرا جی چاہا کہ ان کو گلے لگا لوں، جو کام ہم لوگ خود نہ کر سکے وہ کراچی یونیورسٹی میں انجام پا گیا، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے ایک رات اپنے یہاں ڈنر دیا تو ان اشاریوں کی جلدیں جناب پروفیسر ڈاکٹر یونس حسنی (کراچی یونیورسٹی) نے پیش کیں، جنھوں نے اپنی نگرانی میں وہاں کے ایم۔ اے اردو کے طلبہ اور طالبات سے یہ تیار کرائی ہیں،

ان جلدوں کو میں اپنے سینے سے لگا کر اعظم گڈھ لایا۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے نوائے وقت کے دفتر میں بھی ایک نشست کرائی جہاں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔

پاکستان کے مشہور اور محبوب ادیب اور اردو زبان کے بروکلمان جناب مشفق خواجہ صاحب سے ملنے میں انبساط و نشاط کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اردو ادب کی دلنوازی اور دل ربائی سے کسی کو اس کا مطالعہ کیے بغیر لطف اندوز ہونا ہو تو وہ خواجہ صاحب سے ملے، وہ اپنے ذاتی کتب خانہ میں بیٹھ جاتے ہیں تو ان کی خاموشی ان کی گفتگو اور ان کی بے زبانی ان کی زبان ہو جاتی ہے، مگر جب بولتے ہیں تو رس گھولتے ہیں، انھوں نے ازراہِ نوازش ایک پر تکلف ڈنر پر خاکسار کو مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور جناب نثار احمد فاروقی کے ساتھ مدعو کیا جس میں کراچی کے علمی منطقۃ البروج کے اہم سیاروں کو جمع کیا، بڑی پر کیف مجلس رہی، میری گذارش پر مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے خواجہ صاحب کا شکریہ اپنی پوری شیریں بیانی کے ساتھ ادا کیا، پھر مجھ کو دارالمصنفین کے طریقۂ کار اور آیندہ کے لائحۂ عمل پر بولنے کو کہا گیا جس پر کچھ دیر تک بولتا رہا، خواجہ صاحب کی اس ضیافت کے قمقمے ذہن میں برابر جگمگاتے رہیں گے۔

مولانا ناظم ندوی اور ان کے بچے تو قریبی عزیزوں کی طرح ملتے ہیں، ان کی زندگی کا پر تکلف معیار روز بروز بڑھتا جاتا ہے، ان ہی کے ساتھ ایک رات جناب ظفر احمد انصاری کے یہاں مدعو تھا، جن کے صاحبزادے اور مولانا ناظم ندوی کے داماد نے گلشن اقبال میں ایک بہت ہی عمدہ مکان ابھی حال ہی میں تعمیر کرایا ہے، مولانا ظفر احمد انصاری کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے بے داغ کردار کی وجہ سے ہر حکومت کے زمانہ میں مقبول رہتے ہیں آج کل اسلامک آئیڈیالوجی کے اہم رکن اور صدر ضیاء الحق کے معتمد علیہ بھی ہیں۔

مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی تو علم و فن کے بلبل ہزار داستان ہیں، مذہبی، فقہی، تاریخی، علمی اور ادبی موضوعات پر ان سے زیادہ بہتر فاضلانہ اور پُر مغز گفتگو کرنے والا میں نے کسی کو اور کہیں نہیں پایا، وہ رابطۃ العالم الاسلامی مکہ مکرمہ کے بین الاقوامی المجمع الفقہی کے رکن بھی ہیں، اپنے یہاں ایک نشست میں بینک کے

انٹرسٹ پر گفتگو کرنے لگے تو پورے دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا کہ بینکوں کی طرف سے جو انٹرسٹ ملتا ہے اس سے ایک مسلمان کو حتی الامکان پرہیز کرنا واجب ہے، اور یہ بات تو فرض ہے کہ جہاں اور جس ملک میں اتنی طاقت رکھتے ہوں کہ ملک کے معاشی اور اقتصادی نظام کو ربوی آلودگیوں سے پاک رکھ سکیں، وہاں اس کی اصلاح کے لیے ہر ممکن جد و جہد کریں، اور اگر نہیں کریں گے تو سب کے سب گنہگار ہوں گے، اور قیامت کے دن قابل مواخذہ قرار پائیں گے، لیکن مسلمان جہاں عددی قلت کی وجہ سے بے اختیار ہوں، وہ مسلمان مسلمان یا ہندو سے سودی لین دین نہیں کر سکتے، یہ بہر صورت حرام ہے لیکن اگر بینکوں سے ان کو انٹرسٹ ملے تو وہ اس کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے خرچ کر سکتے ہیں، یہ مرتبہ رخصت اور جواز ہے، عزیمت یہ ہے کہ ایسی رقموں کو رفاہی کاموں اور محتاجوں پر صرف کریں، البتہ رفاہی اداروں یا قومی و جماعتی نفع یا غیر نفع اداروں کو جمع شدہ رقوم پر جو سرکاری خزانوں یا حکومتی بینکوں سے اضافے بنام انٹرسٹ، ڈیوی ڈنڈ یا کسی اور نام سے ملتے ہیں، ضروری ہے کہ یہ رقمیں ان اداروں کے لیے حاصل کر کے ان کے مقررہ اخراجات میں صرف کی جائیں اس عمل میں نہ کوئی کراہت ہے اور نہ گناہ، بلکہ اس کے برخلاف ان کے چھوڑ دینے میں تنگی اور قباحت ہے، فقہائے اسلام کا بھی یہی فیصلہ ہے، اس کے لیے انھوں نے بہت سے دلائل دیے۔

میں نے ان سے یہ عرض کیا کہ آپ کہتے ہیں کہ یہ فقہائے اسلام کا فیصلہ ہے، لیکن اس فیصلہ کا اعلان باضابطہ طور پر کہیں نہیں ہوا، کم از کم ہندوستان کے مسلمانوں کی نظر سے نہیں گذرا، آپ نے جو کچھ کہا وہ آپ کی ذاتی رائے سمجھی جائے گی، اگر یہ ساری باتیں اجماع سے طے ہوں اور فقہائے اسلام یا بین الاقوامی المجمع الفقہی کی طرف سے ان باتوں کا اعلان ہو تو قابل قبول ہو سکتی ہیں، ورنہ ہندوستانی مسلمان اپنی ذہنی کشمکش میں اسی طرح مبتلا رہیں گے جس طرح سے ہیں، کہنے لگے بین الاقوامی المجمع الفقہی کے سامنے یہ مسائل ہیں، میں نے پھر عرض کیا کہ اس پر شاید متفقہ فیصلہ نہ ہو سکے۔

ایک روز جناب جمیل جالبی سابق انکم ٹیکس کمشنر کے دولت کدہ پر بھی ان سے ملاقات رہی، ان کی کتا-

تاریخ زبان اردو پر باتیں ہوتی رہیں، اس پر معارف میں ایک لمبی تقریظ بھی شایع ہوئی ہے، ان تمام جگہوں میں پہونچانے میں میرے داماد ڈاکٹر راشد مصطفیٰ کے علاوہ جناب سہیل سلطان علامہ شبلی کے لڑکے کے نیک طینت داماد اور اعظم گڈھ میں میرے دیرینہ کرم فرما جناب معین الدین (ریٹائرڈ ڈپٹی رجسٹرار کوآپریٹیو سوسائٹی) کے سعادت مند صاحبزادے جناب افضال معین بہت ہی معاون رہے۔

اس مرتبہ کراچی میں دو نئی یافت ہوئی، ایک تو جناب نوی والا صاحب اور دوسرے جناب لطف اللہ خاں صاحب کی تھی، جناب نوی والا صاحب آدم جی مل میں ایک بڑے معزز عہدہ پر ہیں، مذہبی ہونے کے ساتھ علمی ذوق بھی رکھتے ہیں، معارف کے بڑے قدردان ہیں، اس کے شذرات سے متاثر ہوتے ہیں، ان کو کراچی میں میری آمد کی خبر ملی تو مسلسل ٹیلیفون کرتے رہے، پھر ایک روز تحفے تحائف کے ساتھ میری قیام گاہ پر تشریف لائے، ان کے چہرے کو منور پایا، بڑی محبت سے ملے، پھر اپنے گھر پر مدعو کیا، ان کی شاندار کوٹھی میں کتابوں کی کئی الماریاں تھیں جن میں تفسیروں کی تعداد زیادہ تھی، اسلامی حمیت اور غیرت پر کہیں آنچ آجاتی ہے تو اخباروں میں انگریزی مضمون لکھ کر اس کے خلاف احتجاج کرتے ہیں، معارف کا ری پرنٹ کراچی میں بھی چاہتے ہیں، میں نے عرض کیا کہ وہ اس کام کو اپنے ذمہ لیں تو دارالمصنفین کو کوئی اعتراض نہ ہوگا، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف اور ان کی خوبیوں کے بڑے مداح ہیں، ان ہی کے دولت کدہ پر جناب مولانا محمد حسین صاحب دیوبندی اور حاجی ولی محمد احمد صاحب سے بھی ملاقاتیں رہیں، جو بہت لطف و کرم سے پیش آئے۔

جناب لطف اللہ خاں صاحب مدراس کے رہنے والے تھے لیکن رہنے سہنے، بول چال، ملنے جلنے میں شمالی ہند کی تہذیبی روایات کی یاد کو تازہ کرتے ہیں، ان کے فلیٹ میں داخل ہونے پر ان کی ہر چیز میں خوش سلیقگی دکھائی دی، ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی قائم کیے ہوئے ہیں لیکن ان کا اصلی مشغلہ تمام مشاہیر کی آوازوں کو ریکارڈ کرکے ان کے کیسٹ تیار کرنا ہے، ہم آپ جس کی بھی آواز، تقریر، وعظ، گفتگو، لے اور نغمہ سننا چاہیں

ان کے یہاں سن سکتے ہیں، انھوں نے ایسے کیسٹ کے کٹیلاگ تیرہ[۱۳] جلدوں میں تیار کیے ہیں، اسی سے اندازہ ہوگا کہ ان کے یہاں کتنے بے شمار کیسٹ ہوں گے، وہ ان کو فروخت نہیں کرتے بلکہ تیار کرکے ان سفینوں کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں، اگر فروخت کریں تو لاکھوں پائیں، از راہ نوازش میری ایک گفتگو بھی ریکارڈ کی جو دارالمصنفین کی تاریخ پر تھی۔

دارالمصنفین کے بہت بڑے کرم فرما ڈاکٹر عبداللطیف سے ان کے دولت کدہ پر عزیزی سہیل سلطان اور افضال معین کے ساتھ ملا، وہ کویت میں بڑی مدت تک طبی ڈاکٹر رہنے کے بعد کراچی آگئے ہیں، بقیہ زندگی اللہ کی یاد میں گذار رہے ہیں، اپنی گفتگو میں کہا کہ معارف کے شذرات میں غداروں کا جو ذکر کیا گیا ہے، ضرورت اس کی ہے کہ اس موضوع پر پوری ایک کتاب لکھی جائے، یہی بات ان کے صاحبزادے نے بھی کہی، میں ہنس کر خاموش رہا۔

کراچی کے علمی حلقوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ یکایک اعظم گڈھ سے تار پہونچا کہ مجھ کو ۲۶ مارچ کو دہلی پہونچنا ہے، میری لڑکی اپنی لڑکی نازش مصطفیٰ اسلمہا کی بسم اللہ میری موجودگی میں کرنا چاہتی تھی، اس کو یہ تقریب عجلت میں کرنی پڑی، اس میں مذکورۂ بالا تمام کرم فرماؤں کو مدعو کیا، اس موقع پر جناب راز مراد آبادی نے اپنے کلام کو ترنم سے پڑھ کر حاضرین کو بہت محظوظ کیا، پھر مولانا عبدالقدوس ہاشمی، پروفیسر ابوالخیر کشفی اور جناب مشفق خواجہ نے بھی اپنا اپنا کلام سنایا جس سے ایک ادبی مجلس کا لطف آگیا۔

میں ۲۵ مارچ کو دہلی پہونچا، ۱۵ اگست ۱۹۸۰ء میں حکومت ہند کی طرف سے اس خاکسار کو جو اعزاز ملا ہے اس کی باضابطہ سند اور خلعت سے راشٹر پتی نے ۲۶ مارچ کو اپنے یہاں کے ایک دربار میں نوازا۔

اس کی شرکت کے بعد ۳۱ مارچ کو اعظم گڈھ پہونچا تو معلوم ہوا کہ ندوۃ العلماء میں ایک بین الاقوامی سیمینار ۱۷، ۱۸، ۱۹ اپریل کو ہے، یہ گویا اس سال کا تیسرا بین الاقوامی سیمینار تھا، اس میں بیرون کے بجائے

آنکھوں کے بل جاکر شریک ہونا تھا۔

یہ ۱۷؍اپریل کو شروع ہوا، اس کے لیے ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کی نئی عمارت کے ہال کو اس طرح سجایا گیا تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے نئی دہلی کے سیمینار کا وگیان بھون اور اسلام آباد کی نیشنل اسمبلی دونوں کے ہال کی یاد ماند پڑ گئی، ان دونوں ہال کے لیے تو حکومت کے خزانے کھول دیے گئے تھے، مگر ندوہ کے سیمینار کے لیے اخلاص، ولولے، لگن، خدمت، ذوق اور شوق کے بے تحاشہ خزینے کھلے ہوئے تھے، وہاں کے اساتذہ کی خوش سلیقگی، طلبہ کی مستعدی اور دوسرے کارکنوں کی عملی سعی سے پنڈال دامان باغبان اور کف گل فروش نظر آرہا تھا۔

دہلی کے بین الاقوامی سیمینار میں عرب ممالک کا کوئی نمایندہ نہیں پہونچ سکا تھا، اسلام آباد کے سیمنار میں عرب نمایندے ضرور آئے، مگر ان کی اتنی بڑی تعداد وہاں نظر نہیں آئی جتنی کہ ندوہ کے سیمنار میں تھی، ۱۶؍اپریل سے خبر ملنے لگی کہ حکومت قطر کے جید عالم شیخ عبد اللہ ابراہیم الانصاری تشریف لے آئے، جن کا دینی، ادبی اور علمی پایہ پورے اسلامی ملک میں مشہور ہے، پھر سننے میں آیا کہ عالی مرتبت سید عبد العزیز رفاعی سابق سکریٹری مجلس الوزراء مملکت سعودیہ بھی پہونچ گئے، انھوں نے صحابۂ کرام رضؓ کو ان شخصیتوں کے ادبی پہلو پر ایک سلسلہ تیار کیا ہے جو صرف دینی شخصیتیں سمجھی جاتی ہیں، پھر معلوم ہوا کہ استاذ عبد الرحمن رافت الباشا بھی آگئے ہیں جنھوں نے الشعر الاسلامی، النثر الاسلامی اور ادب الدعوۃ کے موضوع پر ایک مستقل کتب خانہ تیار کر دیا ہے اسی طرح یہ اطلاع ملی کہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، جامعۃ الملک عبد العزیز (جدہ و مکہ) جامعۃ الامام محمد ابن سعود، جامعۃ العین (امارات شرعیہ) جامعہ قطر، جامعہ عمان (شرق اردن) کے عربی شعبوں کے اساتذہ اور صدر بھی پہونچ گئے ہیں، مصر کے وفد میں وہاں کے وزیر اوقاف ڈاکٹر زکریا اور نائب وزیر ڈاکٹر عبد اللہ عبد الشکور رہتے، دوبئی کے فضلاء و ادباء کا بھی ایک وفد تھا، جامعۃ الملک عبد العزیز کی طرف سے شام کے مشہور فاضل اور کثیر التصانیف عالم استاد حسن عبد الرحمن بھی شریک ہوئے، سلطنت عمان کے

مفتی حمد الخلیلی بھی تشریف لائے، ابوظبی کی نمایندگی الدکتور تقی الدین الندوی مستشار علمی دائرۃ القضاء الشرعی و استاذ حدیث عین یونیورسٹی نے کی، پاکستان سے مولانا ناظم ندوی آئے جو دار العلوم ندوہ کے طالب علم اور یہاں کے محبوب استاذ بھی رہ چکے ہیں، عربی زبان میں ان کی قدرت اور مہارت کی شہرت عرب ممالک میں بھی ہے، عرب ممالک کے بیالیس ۴۲ فضلاء تھے جو سب اپنے خرچ سے آئے، یہ مولانا ابو الحسن علی ندوی کے اخلاص، دینی خدمت اور عالمگیر شہرت کی کرامت تھی کہ ان کی آواز پر تمام عرب ممالک لبیک کہنے کے لیے امنڈ پڑے، ان کے علاوہ ہندوستان کے مختلف گوشوں کے نمایندے بھی پہونچے، عربی کے ساتھ اردو کا بھی مذاکرہ رکھا گیا تھا جس میں دار المصنفین اور ندوۃ العلماء کے علاوہ علی گڑھ، دہلی، کلکتہ، لکھنؤ اور بنارس یونیورسٹیوں کے نمایندے شریک ہوئے، مذاکرہ کا عنوان یہ تھا: ادبیات کا اسلامی تصور۔

خطبۂ استقبالیہ میں مولانا ابو الحسن علی ندوی نے اپنی فصیح اور بلیغ عربی میں بہت ہی موثر انداز میں یہ کہا کہ قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے کہ عربی زبان زندہ ہے، اور اپنے مرکز سے ہزاروں میل کے فاصلے پر آج اس کے ادب پر مباحثہ ہو رہا ہے، پھر تفصیل سے بتایا کہ اس ملک میں ادب، فلسفہ، تفسیر اور حدیث میں ایسا کام ہوا جس کی مثال دوسرے ملکوں میں مشکل سے ملے گی، فخر کے ساتھ یہ بھی کہا کہ یہاں کے علماء نے ملک کے زبان و ادب کی ترقی میں قائدانہ حصہ لیا اور وہ یہاں کی علمی و ادبی زندگی میں اس طرح گھل مل گئے کہ اس کا اعتراف ہر جگہ کیا جارہا ہے، اس سلسلہ میں دار المصنفین، علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور اس کے دوسرے خدمت گذاروں کے نام خاص طور پر لیے، مولانا نے اس پہلو کی بھی وضاحت کی کہ ندوۃ العلماء کے بانیوں اور اس کے نامور فضلاء نے ایسا نصاب تعلیم مرتب کرنے کی سب سے پہلے دعوت دی جس میں دین اور ادب ایک دوسرے کے معاون ہوں۔

اس خطبہ کے بعد کچھ افتتاحی تقریریں بھی ہوئیں مقرروں میں سب سے نمایاں ڈاکٹر فتحی عثمان رہے، جو امام محمد بن سعود یونیورسٹی ریاض کی عربی فیکلٹی کے ڈین ہیں، انھوں نے بڑی فراخدلی سے ہندوستان کے ان

علماء کی تعریف کی جنھوں نے اسلامی علوم و فنون کی خدمت کی ہے، ان میں علامہ شبلیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا مسعود عالم ندوی اور مولانا ابو الحسن علی ندوی کے نام خاص طور پر لیے، ان کی تقریر سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہاں کے علماء کی علمی سرگرمیوں سے اچھی طرح واقف ہیں، ان کی تقریر ختم ہوئی تو مولانا ناظم ندوی نے اٹھ کر ان کو گلے سے لگالیا۔

دوسرے دن اسی پنڈال میں سمینار شروع ہوا تو ایسا معلوم ہوا کہ آنکھوں کے سامنے سینما کے سیمیں پردے پر یکایک سین بدل گیا ہے، جگہ وہی تھی لیکن اس کی ترتیب ایسی بدل دی گئی تھی کہ عرب نمایندے ایک طویل مستطیل پنڈال کے تین طرف ایسے بیٹھے نظر آئے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم عباسیہ دور کے بغداد کے بیت الحکمت اور قرطبہ کی مسجدوں کی علمی مجلسوں کے کسی اہم اجتماع کو دیکھ رہے ہیں، ہر طرف علم کی چاندنی اور مہتابی چھٹکی ہوئی ہے یہ دینی، علم اور فضل کے نمایندے نہیں بلکہ فرشتے ہیں جن کے انوار سے پوری فضا منور ہو رہی ہے، راقم کو بہت سے بین الاقوامی سمیناروں میں شرکت کرنے کا موقع ملا، مگر یہ اثر آفرینی اور دلکشی کہیں دیکھنے میں نہیں آئی اس میں علمی اخلاص، علمی متانت، علمی وقار اور علمی وزن کی بڑی جلوہ سامانیاں تھیں۔

سمینار کے آغاز میں شیخ محمد المجذوب استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ نے یہ تجویز پیش کی کہ میزبان ادارہ کے سربراہ ہی کو سمینار کے ہر اجلاس کا صدر ہونا چاہیے تاکہ مہمانوں میں سے کسی کو یہ شکایت نہ ہو کہ ان کو کسی اجلاس کا صدر نہیں بنایا گیا، اس طرح بالاتفاق مولانا ابو الحسن علی ندوی اس اہم بین الاقوامی اجتماع کے صدر ہوئے، وہ اپنی شیروانی اور پائجامہ میں ملبوس تھے، البتہ سر پر ایک سفید عربی رومال ڈال رکھا تھا، صدارت کی کرسی پر بیٹھ کر ان کی نظر اس اہم اجتماع کی طرف اٹھی ہوگی تو ان کو غیر شعوری یا شعوری طور پر محسوس ہوا ہوگا کہ انھوں نے ندوہ کے ایک گوشہ میں رہ کر اپنی تمناؤں کے مرغزار، اپنی آرزوؤں کے گلزار اور اپنی خواہشوں کے سمن زار کا

جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر ندوہ کے اس پُر کیف اور دل نواز اجتماع میں پوری ہوتی دکھائی دے رہی ہے، فرطِ نشاط میں اُن کے دل کی گہرائیوں میں ان کی شادمانیوں اور کامرانیوں کا ایک چمنستان آباد ہو گیا ہوگا، ان کا ہر بنِ مو شاداں اور فرحاں ہو رہا ہوگا کہ اس وقت اسلامی علم و ادب کی عطر آگینی اور نکہت بیزی سے ندوہ کی فضا معطر ہو رہی ہے۔

کارروائی کو کنڈکٹ کرنے کی خدمت علامۂ ادب استاد راحتؔ پاشا نے انجام دی جو جامعہ محمد بن سعود میں عربی ادب کے استاد ہیں، تمام عرب نمایندے مولانا ابو الحسن علی ندوی کی علمی سطوت اور دینی سطوت سے متاثر نظر آ رہے تھے، ان کی زبان ان کو الشیخ الکبیر اور بقیۃ السلف الصالحین کہتے کہتے خشک ہو رہی تھی، اس مذاکرہ کا عنوان "ادبیات کا اسلامی تصور" تھا، کل اڑتالیس مقالات پڑھے گئے، دس قصیدے بھی سنائے گئے، عربوں نے بڑی فراخدلی سے اس کا اعتراف کیا کہ ندوہ نے عربی نثر اور مقالہ نگاری کا ایک ایسا اسلوب پیش کیا ہے جو عربی زبان و ادب کی حلاوت، فصاحت اور دعوت کی روح اور طاقت دونوں کے عمدہ نمونے ہیں۔

اس اجتماع کے آخر میں متفقہ طور پر یہ تجویز بھی منظور ہوئی کہ ادبیات کے اندر اسلامی تصورات کی تلاش اور ادبی کاموں میں اخلاقی اور تہذیبی عناصر کو روشن اور واضح کرنے کے لیے ایک مستقل سکریٹریٹ قائم کیا جائے، جس کا صدر مقام ندوۃ العلماء ہو، عرب ممالک کے فضلاء نے اس تجویز کو منظور کر کے دار العلوم ندوۃ العلماء کی مقبولیت اور شہرت کے گلے میں ایک مرصع کار مینا نگار ہار پہنا دیا ہے، اس طرح اس کی ذمہ داری بڑھ گئی ہے، اب اس کو اور بھی عظیم تر سفر پر اٹھ کھڑا ہونا ہے، دعا ہے کہ اس کی کٹھن منزلوں کو طے کرنے میں اس کو وہی کامیابی ہو جو اس سمینار کو انجام تک پہونچانے میں ہوئی۔

اردو سیکشن کا سمینار بھی ہوا، مگر مجمع کی آنکھیں عربی سمینار کی تابناکیوں سے زیادہ چکاچوند رہیں، مولانا ابوالحسن علی ندوی عربی سمینار کی صدارت کو چھوڑ کر اپنی مقناطیسی شخصیت کے ساتھ جب کبھی اردو سمینار میں تشریف لے آتے تو اس میں بھی روح اور زندگی پیدا ہو جاتی، انھوں نے اس کو بھی اپنی سحر پرداز تقریروں سے مسحور کیا، اور بار بار یہ بات دہرائی کہ مولانا شبلیؒ نے جو اسلوب عطا کیا ہے اس سے بہتر اسلوب کسی اور کے یہاں نہیں ملا، اس کے تین ۳ اجلاس ہوئے، پہلے کی صدارت خاکسار نے جناب ضیاء الحسن فاروقی جامعہ ملیہ کے تعاون سے کی، اس موقع پر خاکسار کو اس کی وضاحت کرنے کا موقع ملا کہ علامہ شبلیؒ نے کس طرح ادب کو اسلامی علوم و فنون سے سنوارا، اور پھر اسلامی علوم و فنون ان کے ادب و انشار کی وجہ سے کس طرح نکھر کر سامنے آئے، دوسرے اجلاس کی صدارت پاکستان کے مولانا ناظم ندوی نے کی، تیسرے کے صدر ڈاکٹر عطا کریم برق ہوئے جو کلکتہ یونیورسٹی میں شعبۂ عربی، فارسی اور اردو کے صدر ہیں، کل چوبیس ۲۴ مقالے پڑھے گئے، کارروائی کو ڈاکٹر محمد اقبال انصاری صدر شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ چلاتے رہے، مولانا ابوالحسن علی ندوی کی موجودگی میں مولوی ضیاء الدین اصلاحی (دار المصنفین) نے "قرآن مجید کے بعض اسالیب" اور پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی جامعہ ملیہ نے "اقبال فلک مشتری پر" کے عنوانات سے اپنے مقالات پڑھے، یہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کو خاص طور سے پسند آئے، جو ان مقالہ نگاروں کی محنت کا اصلی صلہ تھا۔

مطبوعات جدیدہ

خلافت و ملوکیت تاریخی و شرعی حیثیت } مرتبہ جناب صلاح الدین یوسف صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۵۸۴، مجلد مع گردپوش، قیمت مجلد پندرہ روپے ۱۵، غیر مجلد دس روپے پچاس پیسے، پتہ: المکتبۃ السلفیہ شیش محل روڈ، لاہور ۲۔

"خلافت و ملوکیت" مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ بانی جماعت اسلامی کی مشہور متنازعہ کتاب ہے، اس کے جواب میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، یہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے اس کے شروع میں اسلامی معاشرہ کے زوال کے اسباب کا تجزیہ کرکے اس غلطی کی نشاندہی کی ہے جو مولانا مودودی اور بعض دوسرے اشخاص نے خلفائے راشدینؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے عہد کے جائزہ میں کی ہے، مصنف نے خلافت و ملوکیت کے ماخذوں سے استفادہ کرنے میں مولانا مودودی کی بے احتیاطی دکھائی ہے، اور اسلام کے نظریۂ سیاست اور نظام حکمرانی پر بحث کے ضمن میں لکھا ہے کہ خلافت و ملوکیت فی نفسہ بھلی یا بری نہیں ہیں، بلکہ ان کی خوبی اور خرابی میں اصلی دخل خود خلیفہ یا بادشاہ کی سیرت، کردار اور عمل کا ہوتا ہے، اسی لیے ان کے نزدیک حضرت امیر معاویہؓ اور ان کے بعد کے دور کا نظام حکومت بھی اسلامی ہی تھا، وہ مولانا مودودی کی یہ رائے تسلیم نہیں کرتے کہ حضرت امیر معاویہؓ جیسے جلیل القدر صحابی کے زمانہ میں جب کہ متعدد ممتاز صحابہؓ بھی موجود تھے اسلامی حکومت کی تمام خصوصیات ختم ہو گئی تھیں اور اس نے خالص دنیوی حکومت کا ڈھانچہ اختیار کر لیا تھا، اسی سلسلہ میں عدالت صحابہؓ کے متعلق مولانا کی رائے پر تبصرہ بھی کیا ہے، وہ مولانا کی ان تاریخی کتابوں کو تمام تر صحیح باور کر لینے پر سخت حیرت ظاہر کرتے ہیں جن کی روایتوں کی نہ چھان بین کی گئی ہے اور نہ ان کے

بارہ میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ وضاعین اور اہل تشیع کی روایتوں سے یکسر پاک ہیں، اس ضمن میں ابن سعد، ابن جریر، ابن عبدالبر، ابن اثیر اور ابن کثیر کی کتابوں اور تاریخوں کی اصل حقیقت و نوعیت بھی واضح کی ہے، وہ مولانا کی اس رائے پر بھی سخت بے اطمینانی ظاہر کرتے ہیں کہ تاریخی روایتوں کو جانچنے کے وہ طریقے صحیح نہیں ہیں جو احادیث کے لیے اختیار کیے گئے ہیں، کیونکہ اس سے تاریخ اسلام خصوصاً قرن اول کا ۹۰ فی صد حصہ غیر معتبر قرار پائے گا، اس کی تردید کے لیے مصنف نے حافظ ابن کثیر اور دوسرے علمائے اسلام کی کتابوں سے مثالیں نقل کرکے دکھایا ہے کہ ان حضرات نے بھی تاریخی روایات کے رد و قبول میں محدثین کے اصولِ نقد و جرح کو سامنے رکھا ہے، ایک باب میں خلفائے راشدین رض کے انتخاب کی نوعیت بیان کرکے ثابت کیا ہے کہ اس وقت ولیعہدی اور نامزدگی کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا، حضرت عمر رض نے اپنے فرزند حضرت عبد اللہ بن عمر رض کی نامزدگی کی مخالفت دوسری وجہوں سے کی تھی اور حضرت علی رض نے حضرت حسن رض کی نامزدگی کی تجویز کو غلط نہیں کہا تھا، وہ مولانا مودودی کی اس رائے کو درست نہیں مانتے کہ خلفائے راشدین کے نزدیک خلیفہ کو عام مسلمانوں کے باہمی مشورے اور ان کی آزادانہ رائے سے منتخب کیا جانا چاہیے، کیونکہ یہ طریقہ کسی خلیفہ کے انتخاب میں اختیار نہیں کیا گیا تھا، مولانا نے خلافت کی جو چھ خصوصیات بتائی ہیں مصنف نے ان کو ذکر کرکے دکھایا ہے کہ وہ سب کم و بیش حضرت معاویہ رض کے زمانہ میں بھی پائی جاتی تھیں، چوتھے باب میں پہلے حضرت عثمان رض پر ان کے جن اقدامات کی وجہ سے اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کا مدلل جواب دیا ہے، پھر حضرت علی رض کی خلافت کے متعلق مولانا کے بیانات کا تضاد دکھایا ہے اور آخر میں جمل اور صفین کی جنگوں اور معاہدہ تحکیم وغیرہ کی انھوں نے جس انداز سے تصویر کشی کی ہے اس پر نقد کرکے اس کی خامیاں واضح کی ہیں، آخری باب میں ملوکیت کو اسلامی معاشرہ کے بگاڑ کا سبب قرار دینے کی تردید کی ہے اور حضرت امیر معاویہ رض پر اعتراضات کا جواب دیا ہے، مولانا مودودی نے متعدد صحابہ رض خصوصاً حضرت عثمان رض و امیر معاویہ رض کے بارے میں جو ناروا طرز و لب و لہجہ اختیار کیا ہے مصنف نے اس پر جابجا ناگواری ظاہر کی ہے، ان کو مولانا سے ایک خاص شکایت یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ حضرت عثمان رض و امیر معاویہ رض وغیرہ کے بارے میں متداول تاریخوں کی ہر رطب و یابس روایت کو صحیح قرار دینے پر اصرار کرتے ہیں، اور ایسے موقع پر صحابہ رض کی عظمت و عدالت کی بھی پروا نہیں کرتے، لیکن دوسری طرف حضرت علی رض کے متعلق اسی قسم کی روایتوں کی چھان بین کی تلقین کرتے ہیں، اور انھیں صحابہ رض کی عظمت و عدالت کا سہارا لیکر مسترد بھی کر دیتے ہیں، اس کتاب کے بعض مندرجات پر قیل و قال کی گنجائش ضرور ہے، کہیں کہیں بیجا تاویل اور خوردہ گیری سے بھی کام لیا ہے، بعض مباحث میں تکرار اور غیر ضروری طوالت بھی ہے، تاہم مولانا مودودی نے حضرت عثمان رض و امیر معاویہ رض کی شخصیت کو مجروح کرنے والی تاریخی روایتوں کو جس انداز سے نمایاں کیا ہے اس کتاب سے اس کی تردید ہو جاتی ہے۔

"ض"

جلد ۱۲۷　ماہ شعبان المعظم ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ جون ۱۹۸۱ء　عدد ۶

مضامین

مقالات

ادبیات